نومبر دسمبر ۱۹۶۳ء

ماہنامہ

میثاق

لاہور

زیر ادارت

امین احسن اصلاحی

اس شمارہ کی قیمت : نوے پیسے

قیمت فی پرچہ ساٹھ پیسے

سالانہ چھ روپے پچاس پیسے

Regd. No L. 7360

Monthly "MEESAAQ" Lahore.

November - December 1963

چند اہم مطبوعات

تصانیف مولانا امین احسن اصلاحی

تدبر قران (قران فہمی کی رهنما)	3—25
تدبر قران (تفسیر آیه بسم‌الله و سوره فاتحه)	0—75
اسلامی قانون کی تدوین	3 - 00 و 2—00
عائلی کمیشن رپورٹ پر تبصره	2—25
تزکیه نفس	6—00 و 3—75

مطبوعات دیگر مصنفین

حضرت محمد ص	22—50
(آنحضرت ص) سیرت ابن هشام	10—00
ابوبکر رض صدیق اکبر	10—00
عمر رض فاروق اعظم	20—00
امام اعظم رح	4—00
حیات امام احمد بن حنبل رح	10—00
آثار امام شافعی رح	12—00
حیات امام مالک رح	10—00
حیات شیخ الاسلام ابن تیمیه رح	21—00
تعبیر کی غلطی (جماعت اسلامی کا جائزه)	6—00
زاد سفر (حصه اول)	3—75
قادیانیت	4—00
ISLAM & THE WORLD	4—00

مکتبہ میثاق (رحمان پوره) - اچھره - لاهور—12

اس کی روایات یہی تھیں اور ہم خود اس کے شاہد ہیں۔ مجھے کسی زمانے میں ایک ماسٹر صاحب نے ہندی کی کچھ حرف شناسی کرائی تھی، ان کی سکھائی ہوئی ہندی تو میرے ذہن و دماغ سے اب بالکل حرفِ غلط کی طرح نکل گئی لیکن خود استاذ کی تعظیم و محبت اب بھی میرے دل میں جاگزیں ہے اور وہ کبھی نہیں نکلے گی حالانکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ وہ ماسٹر صاحب ایک نہایت پختہ زنار بند تھے اور مجھے ان کی اس پختہ زناری کا علم تھا۔ اسی طرح مدرسۃ الاصلاح کے دور میں مجھے بنوٹ کے ایک استاد نے بنوٹ کے کچھ ہاتھ بتانے کی زحمت اٹھائی تھی، اس قسم کے فنون سے مجھے کچھ واجبی واجبی ہی سی مناسبت رہی ہے لیکن سارے شاگردان کی عزت ایک استاد ہی کی طرح کرتے تھے حالانکہ وہ ایک ناخواندہ آدمی تھے اور ہم اپنے آپ کو عالم فاضل سمجھتے تھے۔ میرے جس استاذ نے مجھے مکتب میں اُردو کا قاعدہ پڑھایا تھا وہ بعد میں گردشِ روزگار کے ہاتھوں یکہ ہانکنے پر مجبور ہوئے (اس زمانے میں ہمارے قدیم وطن میں تانگے کی جگہ یکوں کا رواج تھا) لیکن ان کے اس پیشہ کے باوجود میں جب کبھی ان کو دیکھتا تو میرا سر فوراً ان کی تعظیم کے لئے جھک جاتا۔

یہ چند باتیں میں نے محض بطور مثال ذکر کی ہیں جن سے یہ اندازہ کرانا مقصود ہے کہ استاذی اور شاگردی کے رشتہ کے معاملے میں ہماری مشرقی اور اسلامی روایات کا ابھی ہمارے بچپن اور ہماری جوانی تک کیا حال رہا ہے۔ لیکن اب یہ رشتہ بالکل اجیر اور مستاجر کا رشتہ بنتا جا رہا ہے اور آہستہ آہستہ اس کی عزت و حرمت ختم ہوتی جا رہی ہے حالانکہ یہی رشتہ ہے جو ماضی کی معنوی اور علمی وراثت کو حاضر اور مستقبل کی طرف منتقل کرنے کا واسطہ اور ذریعہ بنتا ہے، اسی کے ہاتھوں ہم انسانیت کے پچھلے اندوختہ کے امین بنتے ہیں، اور اس کے تعلق سے سلف کے علوم و افکار، ان کے نظریات و تجربات، ان کے فلسفہ اور سائنس اور ان کی تہذیب و روایات حاضر کی طرف منتقل ہوتے ہیں اور پھر حاضر ان کو اپنی کسوٹیوں پر پرکھ کر، ان کو نکھار کر اور اپنی محنتوں کے ثمرات سے ان میں اضافہ کر کے ان کو مستقبل کی طرف بڑھاتا ہے۔ اگر یہ تعلق کمزور یا بے وقعت ہو جائے یا خدانخواستہ ٹوٹ جائے تو یہ ایک عظیم حادثہ ہوگا۔ جس کے نتائج نہایت دور رس اور نہایت ہولناک ہوں گے۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ماضی اور مستقبل کے اس تعلق کی بیچ کی کڑی ہمارے وہ طلبہ ہی ہیں جو آج کالجوں اور یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں۔ وہی آج کے متعلم اور کل کے معلم ہیں۔ اگر انہوں نے اپنے مقام کو نہ پہچانا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہمارا حاضر بھی تاریک اور ہمارا مستقبل بھی تاریک!

تعلیم کے ذمہ داروں سے ہماری گزارش یہ ہے کہ آپ طلبہ کو جو کچھ بنانا چاہتے ہیں پہلے وہی کچھ خود بنیئے۔ طلبہ سے اگر درویشی مطلوب ہے (اور ہمارے نزدیک یہ مطلوب ہونی چاہیئے) تو آپ بھی دوسری تمام ترغیبات سے بالاتر ہو کر علم و فن اور تحقیق و جستجو کے زاویہ میں معتکف ہونے کی خو پیدا کیجئے۔ اگر آپ طلبہ سے یہ چاہتے ہیں کہ وہ آپ کو اُستاذ، گرو، باپ اور مرشد مانیں (بلاشبہ آپ کو یہ چاہنے کا حق ہے) تو آپ کو بھی اپنے اندر باپ کی شفقت اور مرشد کی تڑپ پیدا کرنی پڑے گی۔ یہ ایک حقیقت ہے جس سے انکار ممکن نہیں ہے کہ طلبہ پر جو عکس بھی نمایاں ہوتا ہے وہ در حقیقت ان کے استاذوں اور تعلیمی رہنماؤں ہی کا ہوتا ہے۔ "الولد سرلابیہ" والی بات جس طرح باپ اور بیٹا کے معاملہ میں صحیح ہے اسی طرح استاذ اور شاگردوں کے معاملہ میں بھی صحیح ہے۔

ہماری دلی آرزو یہ ہے کہ ہمارے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں استاذوں اور شاگردوں کے درمیان محبت و اطاعت اور شفقت و عقیدت کی وہی مشرقی و اسلامی روایات قائم ہوں جو کبھی ہماری درسگاہوں کا طرہ امتیاز رہی ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ باقاعدہ ہمارے اساتذہ، طلبہ اور تعلیمی سرپرست حضرات باہم مل کر تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ایک تحریک چلائیں۔ یونیورسٹی کے موجودہ وائس چانسلر صاحب کے متعلق ہم نے سُنا ہے کہ وہ نہایت اچھے اوصاف کے آدمی ہیں اس ہنگامہ کے دوران میں ان کا رویہ بھی بڑا ہی قابلِ تعریف رہا ہے۔ وہ اگر اس مہم کو لے کر اٹھیں تو ہمیں اُمید ہے کہ اس میں کامیابی ہوگی اور ان کی یہ خدمت ہمیشہ یاد رکھی جائے گی۔

اس سلسلہ میں ملک کے اربابِ اقتدار سے بھی ہماری ایک گزارش ہے، وہ یہ کہ پڑھے لکھے لوگوں پر اس قسم کے بحرانی دورے جو پڑتے رہتے ہیں اس میں بہت کچھ دخل اس خرابی کو بھی ہے جو اس نظامِ تعلیم کے اندر مضمر ہے جو ہمارے ملک میں رائج ہے۔ یہ نظامِ تعلیم کسی بلند نصب العین اور کسی اعلیٰ مطمحِ نظر سے بالکل خالی ہے۔ اس کا مزاج نہ اسلامی ہے، نہ مشرقی اور نہ قومی۔ علاوہ ازیں تعلیم کے ساتھ اس میں تربیت کا تو سرے سے گویا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ لے دے کر ڈسپلن ایک چیز ہے جس سے ہمارے تعلیمی کارفرما آشنا ہیں۔ لیکن جو ڈسپلن بغیر تربیت کے قائم کیا جاتا ہے وہ ہمیشہ طاقت کی پشت پناہی کا محتاج ہوتا ہے اور تجربہ گواہ ہے کہ اس میں کوئی خیر و برکت نہیں ہوتی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارا نظامِ تعلیم ایسا ہو کہ طلبہ کو وہ ایک بلند نصب العین بھی

دے اور ساتھ ہی اس بلند نصب العین کے لئے ان کی اعلیٰ تربیت بھی کرے۔ بغیر اس کے توقع نہیں، کہ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اندر اعلیٰ علمی و اخلاقی ماحول پیدا ہو سکے۔ اگر یہ ماحول پیدا کرنا مطلوب ہے، تو اس کے لئے ناگزیر ہے کہ اس نظام تعلیم کو از سر نو اسلام کی بنیاد پر استوار کیا جائے۔ اور اسلامی اقدار و نظریات اس کے ہر پہلو میں اجاگر کئے جائیں۔

آخر میں ہم چند حرف سیاسی لیڈروں اور سیاسی پارٹیوں سے بھی عرض کریں گے۔ ہمارے نزدیک زیر تعلیم طلبہ کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرنا کمسن بچوں کے اغوا سے کم جرم نہیں ہے ہماری اس رائے کی بنیاد ہرگز ہرگز اس نظریہ پر نہیں ہے کہ سیاست میں حصہ لینا طلبہ کے لئے کوئی حرام شے ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن طلبہ کو قبل از وقت اس کا چسکا پڑ جایا کرتا ہے ان کی تعلیم اور اس کے نتیجہ میں ان کی ساری زندگی بالکل برباد ہو کے رہ جاتی ہے۔ قومی و اجتماعی زندگی میں انہی لوگوں کا دخل ہونا مفید ہوتا ہے جن کا علم بھی پختہ ہو اور جن کی تربیت بھی پختہ ہو۔ اس کے بغیر خام قسم کے لوگ جو میدان میں آکودتے ہیں وہ معاشرے میں تخمہ اور ہیضہ پھیلاتے ہیں۔ ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ قومی زندگی میں کبھی کبھی ایسے اوقات بھی آجاتے ہیں جب ہر شخص کے میدان میں نکل آنے کی ضرورت پیش آجاتی ہے۔ یہ وقت قوم اور ملک کے لئے موت و زیست کا ہوتا ہے اور اس کی نوعیت نفیر عام کی ہوتی ہے۔ ایسے حالات میں طلبہ کو بھی میدان میں نکلنا پڑتا ہے لیکن عام حالات میں طلبہ کے لئے صحیح پالیسی یہی ہے کہ وہ اپنی تعلیمی سرگرمیوں میں منہمک رہیں اور سیاست سے ان کا تعلق صرف علمی و نظری حد تک ہو۔ مولانا محمد علی جوہر رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فقرہ ہمیں نہیں بھولتا۔ انہوں نے ایک تعلیمی ادارے میں طلبہ کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ "بعض لوگ پکنے سے پہلے سڑ جایا کرتے ہیں۔" غالباً ان کا اشارہ ایسے ہی طلبہ کی طرف رہا ہوگا جو قبل از وقت قوم کی قیادت کی ذمہ داریاں اُٹھا لیتے ہیں۔ یہ بات طلبہ اور ارباب سیاست دونوں کے سوچنے کی ہے۔

(۳)

ہمیں اس واقعہ سے بڑا افسوس ہوا کہ قومی اسمبلی نے عائلی قوانین کی تنسیخ کا بل ۲۸ کے مقابل میں ۵۶ ووٹوں سے مسترد کر دیا۔ یہ امر حیرت انگیز ہے کہ ایک ہی قانون سے متعلق ہماری صوبائی اسمبلی اور ہماری قومی اسمبلی کے رویے میں آسمان و زمین کا فرق رہا اس وجہ سے یہ اندازہ کرنا مشکل ہو رہا ہے

کہ اس بل کے متعلق ہماری قوم کے ضمیر کی اصلی آواز کیا ہے؟ تاہم یہ اندازہ تو ہو ہی گیا کہ جس قانون کو ملک کے تمام علماء و مشائخ نے بالاتفاق خلاف شریعت قرار دیا قوم کے نمائندوں کی بھاری اکثریت نے اس کی تصدیق کر دی۔ اس سے ہوا کا رُخ تو بہرحال معلوم ہی ہو جاتا ہے۔

ہمارے نزدیک حزب اختلاف نے بھی اس معاملے میں سخت بے تدبیری سے کام لیا۔ بہتر ہوتا اگر خان عبدالصبور خان کی پیشکش کو منظور کر کے حالات پر پردہ پڑا ہی رہنے دیا جاتا۔ اس پیشکش کو رد کر دینے سے جو نتائج سامنے آئے ہیں وہ اپوا کی بیگمات کے سوا کسی کے لئے بھی خوش کن نہیں قرار دیئے جا سکتے۔

اس قسم کی حرکتوں سے اللہ کی شریعت کو تو کیا نقصان پہنچ سکتا ہے البتہ اس قوم کی بدقسمتی پر ماتم کرنا چاہیے جس کے لیڈر اپنی ہر تقریر کا آغاز اسلام سے کرتے ہیں لیکن اسلام کی شریعت کے معاملہ میں ان کا رویہ یہ ہے جس کا مظاہرہ انہوں نے اپنی قومی اسمبلی میں کیا ہے۔

(۴)

قوم ابھی حسین شہید سہروردی کے ماتم سے فارغ نہیں ہوئی تھی کہ ملک کے نامور عالم مولانا سید داؤد غزنوی نے بھی انتقال فرمایا۔ یہ دونوں حادثے سیاسی اور مذہبی اعتبار سے ہماری پوری قوم کے لئے بڑے ہی اہم ہیں۔ حسین شہید سہروردی ہماری قوم کے بڑے پختہ کار، ذہین اور جری لیڈر تھے۔ اس ملک میں جمہوریت کے نصب العین کے لئے جو کوشش انہوں نے کی اور جس عزم و ہمت کے ساتھ حمایت کی، جمہوریت کے قدردان اس کو ہمیشہ یاد رکھیں گے۔ ہماری قوم میں صحیح معنوں میں عوامی لیڈر اب وہی اکیلے رہ گئے تھے، اب اگرچہ حالات نے ان کو کچھ عرصہ سے عملاً ملکی معاملات سے بہت کچھ الگ کر دیا تھا تاہم اس علیحدگی میں بھی وہ بہتوں کے لئے مرجع امید و اعتماد تھے۔ ان کے اُٹھ جانے کے بعد اب ہماری قوم میں ان کے درجے کا کوئی عوامی لیڈر باقی نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔

مولانا سید داؤد غزنوی رحمۃ اللہ علیہ ایک جید عالم دین ہونے کے ساتھ ایک نامور خانوادۂ علمی و دینی کی نہایت شاندار روایات کے حامل تھے۔ ان کی شخصیت بڑی جاذب و پُرکشش تھی

علماء کے طبقہ میں جو چند اشخاص دین اور دنیا دونوں پر نگاہ رکھنے والے تھے۔ ان میں ان کو ایک امتیاز کا درجہ حاصل تھا۔ ان کے ظرف اور ان کی نگاہ دونوں میں بڑی وسعت تھی۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اتحاد و اتفاق قائم رکھنے کے ہمیشہ وہ دل سے خواہاں رہے اور اس سلسلہ کی تمام مساعی میں ہر شخص کی نظر سب سے پہلے علماء کے طبقہ میں انہی کی طرف اٹھتی تھی۔ وہ شروع سے ایک عملی انسان تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں میں جو قومی و مذہبی تحریکیں اٹھیں ان میں وہ پوری سرگرمی کے ساتھ شریک ہوئے اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ جمعیۃ اہل حدیث کے لئے ان کی حیثیت روح رواں کی تھی۔ اپنی بھاری بھرکم شخصیت سے انہوں نے ایک بہت بڑے خلا کو بھر رکھا تھا جو اب ان کی وفات کے بعد بمشکل خلا ہمارے سامنے موجود ہے۔ ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تعالےٰ مولانا رحمۃ اللہ علیہ کو اعلیٰ علیین میں جگہ دے، ان کے اعزا کو صبر جمیل سے نوازے اور ہماری قوم کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے۔

تدبر قرآن

امین احسن اصلاحی

تفسیر سورۂ بقرہ

(۳۴)

وَاَنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ...... یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ | انفاق کا یہ حکم جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس جہاد کے لئے ہے جس کا یہاں حکم دیا گیا ہے۔ جہاد جان اور مال دونوں کی قربانی کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن میں جہاں کہیں بھی جہاد و قتال کا بیان ہوا ہے انفاق کا حکم بھی اس کے ساتھ ضرور ہوا ہے۔ تُجَاہِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ بِاَمْوَالِکُمْ وَاَنْفُسِکُمْ (اور تم جہاد کرو اللہ کی راہ میں اپنے مال اور اپنی جان سے) "وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّہْلُکَۃِ" میں "بِاَیْدِیْکُمْ" کے الفاظ سے ایک ایسے شخص کی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے جو اوپر سے نیچے کی طرف اپنے دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے کسی دریا یا غار میں چھلانگ لگا رہا ہو۔ بعض عرب شاعروں نے بھی یہ اسلوب استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے سے جی چراتے ہیں، بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو خطرات سے بچا رہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت کے جہنم میں جھونکتے ہیں۔ انسان کے لئے زندگی اور بقا کا اصلی خزانہ خدا کی راہ میں جان اور مال کی قربانی میں ہے نہ کہ ان کے سینتنے اور بچانے میں۔ قرآن نے جگہ جگہ اس حقیقت کی طرف اشارے کئے ہیں۔ سورۂ توبہ میں منافقین کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے۔

وَسَیَحْلِفُوْنَ بِاللّٰہِ لَوِاسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَکُمْ یُہْلِکُوْنَ اَنْفُسَہُمْ وَاللّٰہُ یَعْلَمُ اِنَّہُمْ لَکٰذِبُوْنَ (۴۲-توبہ)	اور وہ عنقریب تمہیں اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلائیں گے کہ اگر ہم سامان کر پاتے تو ضرور آپ کے ساتھ جہاد کے لئے نکلتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو

ہلاکت میں جھونک رہے ہیں۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ بالکل جھوٹے ہیں۔

اس آیت میں "یُهْلِكُونَ اَنْفُسَهُمْ" کے الفاظ سے اسی بخل اور بزدلی کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے بچنے کی تاکید "وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ" کے ٹکڑے میں فرمائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو زندگی اور مال کے حریص کامیابی سمجھتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی نظر میں وہ موت اور ہلاکت ہے۔

"واحسنوا" کا عطف "انفقوا" پر ہے۔ یہاں احسان کے معنی کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو اور وہ مال خرچ کرو جو تمہیں عزیز و محبوب ہو۔ انفاق کے معاملے میں اس احسان کی تاکید قرآن نے جگہ جگہ فرمائی ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ حَمِيْدٌ ۝

(۲۶۷ - بقرۃ)

اے ایمان والو! ان پاکیزہ مالوں سے خرچ کرو جو تم نے تجارت وغیرہ سے کمائے ہوں اور جو ہم نے زمین سے تمہارے لئے پیدا کئے ہیں۔ اور اس میں سے بُرے مال کے خرچ کرنے کا خیال نہ کرو، جسے خرچ تو کرو لیکن اگر وہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھ میچے بغیر نہ لے سکو اور اس بات کو اچھی طرح سمجھ رکھو کہ اللہ بے نیاز اور حمید ہے۔

انفاق میں جب تک اللہ تعالیٰ کے لئے یہ جوش و جذبہ اور یہ احتیاط شامل نہ ہو اس وقت تک اس کو احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہمارے مال کا محتاج نہیں ہے۔ وہ سب سے بے نیاز و بے پروا ہے۔ البتہ ہم خود اس کے جود و کرم کے ہر وقت محتاج ہیں۔ وہ اگر ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے تو اپنے لئے نہیں بلکہ خود ہمارے لئے کرتا ہے تاکہ اس طرح وہ ہمارے خلوص کا امتحان کرے اور ہمارے خزف ریزوں کو قبول فرما کر ان کو ایک ابدی اور لازوال خزانے کی شکل میں ہمیں ایک دن واپس لوٹائے۔

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ...... شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ جس طرح فرض نمازوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل ہیں جن سے اصل نماز کے لئے طبیعت میں بیداری اور آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور اگر اس میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ان سے اس کسر کا جبر بھی ہوتا ہے اسی طرح عمرہ کی نوعیت بھی حج کے لئے ایک ریہرسل کی ہے۔ اس سے حج کے لئے طبیعت میں آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض حالات

میں اس کے کسر کا جبر بھی ہوتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے بھی یہ لفظ تعمیر، رونق اور آبادی کے مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس سے مقصود اللہ تعالیٰ کے گھر کی رونق بھی ہے اور دلوں کی زندگی اور بیداری بھی۔ اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

"اَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ" میں اصل زور "لِلّٰهِ" کے لفظ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب جنگ و جہاد کے مراحل سے گزر کر حج و عمرہ کی سعادت حاصل ہو تو تم یہ حج و عمرہ صرف اللہ وحدہٗ لاشریک کے لئے پورا کرو۔ اس تاکید و تنبیہہ کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ حج و عمرہ تو اہل عرب اسلام سے پہلے بھی کرتے تھے لیکن یہ حج و عمرہ صرف اللہ واحد کے لئے نہیں ہوتا تھا بلکہ اس میں ان کے وہ معبودانِ باطل بھی شریک تھے جن کے بت انہوں نے عین بیت اللہ میں بھی اور مناسک حج کے دوسرے مقامات میں بھی نصب کر رکھے تھے۔ چنانچہ جب یہ حرم میں نماز کے لئے جاتے یا حج و عمرہ کے قصد سے وہاں پہنچتے تو ان کے پیش نظر صرف اللہ کی عبادت نہ ہوتی بلکہ اللہ سے زیادہ ان بتوں کی خوشنودی اور ان کی پرستش ہوتی۔ وہ ان کی پوجا بھی کرتے، ان کے آگے نذر و نیاز بھی پیش کرتے اور ان کے لئے قربانیاں بھی کرتے۔ چونکہ آیت زیر بحث کے نزول کے وقت یہ حالات مکہ میں موجود تھے اس لئے مسلمانوں کو یہ تاکید کی گئی کہ جب تم حج و عمرہ کرو تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے لئے کرو، اس میں کسی شرک و بدعت کی کوئی آلائش شامل نہ ہونے پائے۔ اس حقیقت کی طرف سورۂ کوثر میں بھی اشارہ فرمایا ہے۔ اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ، فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ (ہم نے تمہیں کوثر عطا کیا تو تم اپنے رب ہی کے لئے نماز پڑھو اور اسی کے لئے قربانی کرو) مولانا فراہیؒ نے اپنی تفسیر سورۂ کوثر میں وضاحت کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے کہ کوثر سے یہاں مراد خانہ کعبہ ہے جو آخرت کے حوض کوثر کا اس دنیا میں مجاز ہے اور اللہ ہی کے لئے نماز اور قربانی کی تاکید اس لئے ہوئی کہ اسلام سے پہلے نماز اور قربانی دونوں ہی بیشتر غیر اللہ کے لئے تھیں۔

علاوہ ازیں "لِلّٰهِ" پر زور دینے کی ایک دوسری وجہ بھی ہے۔ وہ یہ کہ اہل عرب کے لئے حج و عمرہ عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئے تھے۔ اُن کے لئے اِن کی حیثیت تجارتی میلوں کی ہو گئی تھی اور وہ مقاصد امتداد زمانہ سے ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے۔ جن کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ چنانچہ اس تجارتی مقصد ہی کے تحت انہوں نے نسئی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کے مہینے کو قمری کے بجائے شمسی حساب کے مطابق کر لیا تھا تاکہ یہ مہینہ تجارتی

نقطہ نظر سے ان کے لئے ہمیشہ مناسب زمانہ میں پڑے۔ یہاں "لِلّٰہِ" کے لفظ سے مسلمانوں کو حج و عمرہ کے اصل مقصود کی طرف توجہ دلائی گئی کہ یہ عبادتیں اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لئے مقرر کی گئی ہیں نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں کے لئے اس وجہ سے تم کفار و مشرکین کے برخلاف اللہ کو اپنا مقصود بناؤ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جو محدود اجازت دی گئی ہے، اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

'فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ' احصار کے معنی گھیر لینے کے ہیں اور یہاں گھیر لئے جانے سے مراد دشمن کی طرف سے گھیر لئے جانے کے ہیں۔ آگے "فاذا امنتم" کے الفاظ سے بھی اسی مضمون کا اشارہ نکلتا ہے اور وقت کے حالات بھی اسی بات کے حق میں ہیں، اس لئے کہ ان آیات کے نزول کے زمانہ میں مکہ پر مشرکین قریش کا قبضہ تھا اور انہوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نکال چھوڑا تھا بلکہ کسی قیمت پر بھی ان کو دوبارہ مکہ آنے کی اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھے، اس امر کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمان اگر حج یا عمرہ کے لئے مکہ کا رُخ کرتے تو وہ پوری قوت سے مزاحم ہوتے۔ چنانچہ ہُوا بھی ایسا ہی۔ صلح حدیبیہ کے موقع پر جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہؓ نے عمرہ کا ارادہ فرمایا تو کفار نے سخت مزاحمت کی۔ یہ صورت حال متقاضی تھی کہ پہلے سے اس امکانی خطرے کے لئے مسلمانوں کو ہدایت دے دی جائے۔ چنانچہ یہ ہدایت دے دی گئی کہ اگر دشمن تمہیں گھیر لے اور بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو جو قربانی تمہیں میسر ہو وہ وہیں پیش کر دو، جہاں گھر جاؤ۔ حضورؐ نے اسی ہدایت کے بموجب حدیبیہ ہی میں قربانی کر کے احرام کھول دیا۔

"وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ" مَحِلّ جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، حَلّ یَحِلّ سے ظرف ہے اور وقت اور جگہ دونوں کے مفہوم پر مشتمل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سر اس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے اور نذر پوری نہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ امن اور احصار کی دو مختلف حالتوں میں قربانی کے ٹھکانے لگنے کی شکلیں دو مختلف ہوں گی اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے دونوں کے ثبوت موجود ہیں۔ حدیبیہ کے موقع پر آپ نے اس صورت پر عمل فرمایا جس پر مجبوری کی صورت میں عمل کرنے کی اجازت ہے اور بعد میں حج اور عمرہ دونوں کے موقع پر وہ طریقہ اختیار فرمایا جو عام حالات کے لئے ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ یہاں جس امن یا احصار کا ذکر ہے اصلاً اس کا تعلق دشمن سے ہے، دوسری مزاحمتیں جو مرض یا کسی اور مجبوری کے سبب سے پیش آجائیں ان کا حکم اصلاً نہیں بلکہ تبعاً یہاں سے نکلتا ہے اور اس کا تعلق اجتہاد سے ہے۔

'فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا ...... اَوْ نُسُكٍ' کسی بیماری یا تکلیف کے سبب سے اگر کوئی شخص قربانی سے پہلے ہی سر منڈانے پر مجبور ہو جائے تو اس صورت میں اس کے اوپر کفارہ ہے۔ قرآن میں اس کفارے کی تین صورتیں بالاجمال بیان ہوئی ہیں۔ روزے یا صدقہ یا قربانی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تشریح فرمادی ہے کہ یا تو تین دن کے روزے رکھ دے یا چھ مسکینوں کو کھانا کھلا دے یا کم از کم ایک بکری کی قربانی دیدے۔

"فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ...... ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ' یہ آفاقی حاجیوں یعنی حدود حرم سے باہر کے عازمین حج کے لئے ایک رخصت بیان ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات حدود حرم کے اندر رہنے والوں کے لئے تو ٹھیک تھی اس لئے کہ ان کے لئے حج اور عمرہ کے لئے الگ الگ سفر کرنا کچھ مشکل نہ تھا لیکن دور سے آنے والے حجاج کے لئے اس میں زحمت تھی اس وجہ سے شریعت نے ان کو یہ رخصت مرحمت فرمائی کہ وہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں ادا کر سکتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ وہ پہلے عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے فارغ ہو جائیں پھر حج کی تاریخوں میں اس کے لئے نیا احرام باندھیں اور مناسک حج ادا کریں۔ البتہ اس صورت میں ان کے لئے قربانی ضروری ہے۔ اگر قربانی میسر نہ آئے تو دس دن کے روزے رکھنے ضروری ہیں۔ تین دن کے روزے ایام حج میں اور سات دن کے حج سے لوٹنے کے بعد۔

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ' یہ احکام و ہدایات کی تفصیل کے بعد احکام کی اصل روح کی طرف توجہ دلا دی کہ اصل مقصود ان تمام احکام سے تقویٰ ہے۔ یہی ان کا حاصل ہے اور اسی سے ان کے اندر زندگی پیدا ہوتی ہے۔ اگر انسان اس چیز کو نگاہ میں نہ رکھے تو نہ تو ان کا حق ہی ادا کر پاتا اور نہ ان سے کچھ حاصل ہی کرتا اور اس کی ساری زندگی خدا سے جھوٹی آرزوئیں باندھنے اور اپنے نفس کو نا روا الاؤنس دینے میں گزر جاتی ہے حالانکہ خدا کے طبعی قوانین جس طرح اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں اسی طرح اس کے شرعی و اخلاقی قوانین بھی اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں۔

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ ...... وَاتَّقُوْنِ يَا اُولِي الْاَلْبَابِ ○ موقع دلیل ہے کہ حج کا لفظ یہاں حج اکبر اور حج اصغر یعنی حج اور عمرہ دونوں ہی کے لئے استعمال ہُوا ہے۔ لفظ قصاص پر بحث کرتے ہوئے ہم الفاظ کی اس مخصوص نوعیت استعمال کی طرف اشارہ کر چکے ہیں۔

"اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمَاتٌ" سے مقصود "ایامِ معدودات" کی طرح ان کے معین و محدود ہونے کی طرف اشارہ کرنا ہے کہ یہ کچھ ایسی غیر محدود و غیر معین مدت نہیں ہے کہ حج یا عمرہ کی نیت کرنے والا ان کی پابندیوں کے تصور سے گھبرا اُٹھے بس چند معلوم و متعین مہینے ہیں تو جو شخص ان میں حج یا عمرہ کا عزم کرے وہ ان کی پابندیوں کو نباہے اور شہوت، نافرمانی اور لڑائی جھگڑے سے بچے اور زیادہ سے زیادہ نیکی اور تقویٰ کی کمائی کرنے کی کوشش کرے۔ اگرچہ انسان کو اس جہاد میں اپنے جذبات و شہوات کی قربانی ضرور دینی پڑتی ہے لیکن یہ چیز ہراساں ہونے کی نہیں ہے۔ انسان کو یاد رکھنا چاہئیے کہ وہ جو چھوٹی سے چھوٹی نیکی بھی کرتا ہے وہ اللہ کے علم میں رہتی ہے اور وہ اس کا ایک دن بھرپور صلہ دے گا۔

یہاں رفث، فسوق اور جدال تین چیزوں کی نفی کی ہے۔ رفث سے مراد شہوانی باتیں ہیں، اس لفظ کی تحقیق اُوپر گزر چکی ہے، فسوق کے معنی خدا کی نافرمانی کے ہیں اور جدال سے مراد آپس کے لڑائی جھگڑے ہیں۔

ان تینوں چیزوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔ حج میں ان چیزوں کی قطعی ممانعت کے بعض خاص وجوہ ہیں۔

ایک وجہ تو یہ ہے کہ اسلام میں یہ عبادت انسان کو ترکِ دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے آشنا کرنے والی ہے جس سے آشنا ہونا اسلام میں مطلوب و مرغوب ہے اور جو تربیت و تزکیہ کے لئے ضروری ہے۔ اس سے آگے رہبانیت کی حدیں شروع ہو جاتی ہیں جن میں داخل ہونے سے اسلام نے روکا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لئے نفس کے اندر اُکساہٹ بہت بڑھ جاتی ہے۔ انسان کے اندر یہ کمزوری ہے کہ جس چیز سے وہ روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر دو چند ہو جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت ہونے کے سبب سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ رہے تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔

"وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى" میں ہمارے نزدیک اصل ترکیب کلام یوں ہے کہ تَزَوَّدُوا التَّقْوٰى فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى یعنی سفرِ حج کے لئے نکلو تو تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلو کیونکہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہے۔ پہلی جگہ ایجاز اور بلاغت کے تقاضے کے تحت تقویٰ کے لفظ کو حذف کر دیا اس لئے کہ آگے اس کا اظہار ضروری تھا، اگر پہلے مقام میں بھی اس کا اظہار کر دیا جاتا تو اس سے کلام میں تکرار کا عیب پیدا ہو جاتا اور قرآن مجید ہر عیب سے پاک ہے۔

اکثر لوگ یہاں تقویٰ کے لفظ کو محذوف نہیں مانتے۔ ان کے نزدیک "تَزَوَّدُوْا" کے لفظ سے لوگوں کو حج کے لئے مادی زادِ راہ لے کر نکلنے کی تاکید کی گئی ہے۔ ان کے خیال میں اس تاکید کی وجہ یہ پیش آئی کہ اکثر اہلِ عرب بغیر کسی زادِ راہ ہی کے حج کے لئے اُٹھ کھڑے ہوتے تھے اور اس طرح خود بھی زحمت اُٹھاتے تھے اور دوسروں کیلئے بھی موجب زحمت بنتے تھے۔ اس وجہ سے ان کو یہ ہدایت کی گئی کہ جب حج کے لئے نکلا کریں تو اس کے لئے زادِ راہ کا انتظام کر کے نکلا کریں۔

اگرچہ یہ بات اپنی جگہ پر بالکل ٹھیک ہے کہ حج کے لئے زادِ راہ کا انتظام مقدم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے حج فرض ہی ان لوگوں پر کیا ہے جو ہر پہلو سے اس کے لئے استطاعت رکھتے ہیں لیکن یہاں یہ معنی لینا عربیت کے بالکل خلاف ہو گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی میں "فَاِنَّ" کا لفظ جب اس طرح آیا کرتا ہے جس طرح اس آیت میں آیا ہے تو وہ اپنے ماسبق کی توجیہہ و تعلیل کے لئے آیا کرتا ہے۔ اگر "تَزَوَّدُوْا" سے مراد مادی زادِ راہ ہوتا تو اس کے بعد اس کی توجیہہ و تعلیل میں بھی اسی کی حکمت بیان ہوتی کہ کیوں اس سفر کے لئے زادِ راہ کا اہتمام ضروری ہے لیکن یہاں حکمت بیان ہوئی ہے تقویٰ کے زادِ راہ کی۔

اس ہدایت کے موقع و محل سے بھی اسی مضمون کی تائید نکلتی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے۔ اُوپر والے ٹکڑے میں یہ فرمایا گیا ہے کہ جو شخص حج کے عزم سے نکلے تو وہ شہوانی باتوں، فاسقانہ حرکتوں اور لڑائی جھگڑے سے کلیۃً احتراز کرے۔ اس مضمون کے ساتھ اگر سب سے زیادہ قریبی جوڑ ہو سکتا ہے تو اسی بات کا ہو سکتا ہے کہ اس مقدس سفر کے لئے آدمی کو رفث، فسوق اور جدال کے بجائے تقویٰ کا زادِ راہ لے کر نکلنا چاہئیے اس لئے کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ ہی کا زادِ راہ ہے۔

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ...... لَمِنَ الضَّآلِّيْنَ یعنی حج

سے اصل مقصود تو تقویٰ ہے۔ اس لئے اس کے واسطے اصلی زادِ راہ تقویٰ ہی کا ہونا چاہیئے لیکن اس امر میں کوئی قباحت نہیں ہے کہ کوئی شخص اس سفر سے کوئی چھوٹا بڑا تجارتی فائدہ بھی اُٹھا لے۔ یہاں "فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ" سے مراد تجارتی فائدہ ہے۔ اس قسم کے معاشی فوائد کے لئے قرآن میں دوسرے مقامات میں بھی یہ لفظ استعمال ہُوا ہے۔ خدا کے حدود کے اندر رہتے ہوئے اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بندہ جو معاشی فتوحات حاصل کرتا ہے وہ سب فضلِ رب میں داخل ہیں۔

اُوپر والی آیت کے تحت ہم یہ اشارہ کر چکے ہیں کہ جاہلیت میں حج کا اجتماع ایک بہت بڑے تجارتی میلے کی نوعیت اختیار کر گیا تھا جس کے سبب سے حج کا اصل مقصد بالکل دب کر رہ گیا تھا۔ قرآن نے یہاں واضح کیا کہ حج کا اصل مقصد عبادت ہے نہ کہ تجارت۔ اس وجہ سے اس سفر میں اسی کے شایانِ شان زادِ راہ لو، اور وہ ہے تقویٰ۔ لیکن اس کے اصل مقصد کے اہتمام کے ساتھ اگر کوئی شخص کوئی نفع بخش کاروبار بھی کرے تو اس سے اس عبادت میں کوئی خرابی واقع نہ ہوگی۔ یہ چیز جائز ہے۔

"وَاذْكُرُوهُ كَمَا هَدَاكُمْ" عرفات سے واپس ہوتے ہُوئے مشعرِ حرام (مزدلفہ) میں رات گزارنے اور وہاں اللہ کی یاد کرنے کا حکم ہے۔ اس یاد کرنے کے متعلق یہ ہدایت فرمائی کہ یہ اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے تمہیں بتایا اور سکھایا ہے، یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادت کی صورت میں اس طریقہ پر نہ ہو جو تم نے جاہلیت کے زمانے میں اختیار کر رکھا تھا۔ جس طرح اس زمانے میں لوگ عید وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کرتے ہیں، پکنک کے پروگرام بناتے ہیں، مشاعروں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں، یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلیں بھی کہیں کہیں آراستہ ہو جاتی ہیں، اسی طرح جاہلیت میں بھی لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے اور قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے۔ قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی اس لئے کہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لئے ہے۔

"وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِ لَمِنَ الضَّالِّينَ" بطورِ امتنان و احسان کے ارشاد ہُوا ہے جس طرح سُورہ جُمعہ میں ہے۔ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ (بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے) مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے احکام و آداب سے متعلق تمہیں جو رہنمائی کی جا رہی ہے اس کی قدر کرو، اس لئے کہ اب تک تم ان مقامات کو کھیل تماشے کی جگہیں بنائے بیٹھے تھے حالانکہ یہ مقامات

انوارِ معرفت کی جلوہ گاہ ہیں لیکن تم نے اپنی جہالت کے سبب سے جواہرات کے معادن کو کوئلے کی کانیں سمجھا۔

ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں خطاب خاص قریش سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناسکِ حج کے معاملہ میں جو پابندیاں دوسروں پر ہیں بعینہٖ وہی پابندیاں تمہارے اُوپر بھی ہیں اس وجہ سے جس طرح دوسرے تمام لوگ عرفات جاتے اور وہاں سے لوٹتے ہیں اسی طرح تم بھی عرفات جا کر وہاں سے لوٹا کرو۔ اس ہدایت کی ضرورت اس وجہ سے پیش آئی کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں حج کے موقع پر خاص اپنے لئے عرفات کی حاضری ضروری نہیں سمجھتے تھے، صرف مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے لوٹ آتے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ وہ بیت اللہ کے پروہت اور مجاور ہیں اس وجہ سے ان کے لئے حدودِ حرم سے باہر نکلنا مناسب نہیں۔ بندگی میں بھی انہوں نے اپنے لئے ایک امتیاز قائم کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے اس خود ساختہ امتیاز کو ختم کر کے سب کو ایک سطح پر کر دیا۔

فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ ...... مِنْ خَلَاقٍ

مناسکِ حج سے فراغت کے بعد لوگوں پر، جیسا کہ ہم اُوپر اشارہ کر آئے ہیں، تفریحات اور دلچسپیوں کا موڈ طاری ہوتا تھا اور شعر و شاعری اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں، خاص کر قیامِ منیٰ کے ایام تو انہی چیزوں کے لئے خاص ہو کر رہ گئے تھے۔ شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبیلوں اور اپنے آبا و اجداد کے مفاخر نثر و نظم میں بیان کرتے اور طلاقتِ لسانی سے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اس لغویت کی بھی اصلاح کی اور اس کی جگہ اس سے زیادہ اہتمام اور اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنے کی ہدایت کی۔

"فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا الآیۃ" یہ اشارہ ہے ان لوگوں کی طرف جن کے دل و دماغ کے ہر گوشے پر محبتِ دنیا کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ اسی چیز پر نگاہ رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سرِ فہرست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں حج جیسی عظیم عبادت کا موقع بھی نصیب ہوتا ہے تو اس میں بھی قبولیتِ دعا کے ہر موقع و محل میں خدا سے اپنی دنیوی آرزوؤں ہی کی تکمیل کے لئے دُعا کرتے ہیں۔ درآنحالیکہ ان کی آخرت کا خانہ بالکل ہی خالی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو حج کرتے ہی اپنے کسی

کسی دنیوی مقصد کے لئے ہیں وہ جس مقام کو بھی سمجھتے ہیں کہ یہاں دُعا قبول ہوتی ہے وہاں وہ اپنی وہی درخواست پیش کرتے ہیں جو ان کے دل پر غالب ہوتی ہے۔ وہ اُس کے ساتھ اُخروی فلاح کا کوئی ذکر بھی پسند نہیں کرتے کہ مبادا یہ چیز ان کی اصل آرزو کے لئے خدا کے سامنے کوئی حجاب بن جائے۔

اسی طرح کے لوگ ہیں جنہوں نے دین کی ہر چیز کو دنیوی مفادات کے سانچوں میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے جس سے دین کا حلیہ بگڑا ہے۔ اسی طرح کے لوگ تھے جن کی دنیا پرستیوں نے حج جیسی عظیم عبادت کو بھی زمانہ جاہلیت میں، جیسا کہ اُوپر گزرا، ایک تجارتی میلے کی شکل میں بدل دیا، اور یہی رجحان ہے جو اس دَور میں حج کو صرف ایک سالانہ کانگریس کی حیثیت سے نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ حالانکہ حج کی اصل ابراہیمی رُوح ہجرت الی اللہ ہے۔ اس کے دنیوی فوائد صرف ضمنی ہیں۔

وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّقُوْلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً .... وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ | یہ اشارہ ہے اُن لوگوں کی طرف جن کے ذہن دنیا اور آخرت دونوں کے معاملے میں بالکل متوازن ہیں اور جو دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی اپنے ربّ سے مانگتے ہیں۔ پہلے گروہ کے بعد اس گروہ کا ذکر یہ بتانے کے لئے ہے کہ اس گروہ کی طلب اللہ کی نگاہوں میں پسندیدہ ہے اور اہل ایمان کو یہی طریقہ اختیار کرنا چاہیئے۔ اس دعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے ربّ سے دُنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیئے اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑنا چاہیئے وہی سب سے زیادہ بہتر طریقہ پر جانتا ہے کہ ہمارے لئے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دُنیا کی چیزوں میں سے کسی چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لئے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس وجہ سے بندے کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑے، اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے۔ البتہ دوزخ کے عذاب سے برابر پناہ مانگتا رہے، یہ بڑی سخت چیز ہے، بندے کی سب سے بڑی کامیابی یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو دوزخ سے پناہ میں رکھے۔

• اُولٰٓئِكَ لَهُمْ نَصِيْبٌ مِّمَّا كَسَبُوْا " (یہی لوگ ہیں جو اپنی کمائی کا حصّہ پائیں گے) پہلے گروہ کے

متعلق جو صرف دنیا کا طالب بنتا ہے، یہ فرمایا کہ " ان کا آخرت میں کوئی حصّہ نہیں ہے " لیکن اس دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہُوا کہ یہ اپنی کمائی کا حصّہ پائیں گے اور یہ حصّہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے بدلے کے لئے مقرر فرما رکھا ہے۔

" وَاللّٰهُ سَرِيْعُ الْحِسَابِ " (اور اللہ جلد حساب چکانے والا ہے) تہدید اور تسلی دونوں موقعوں کے لئے موزوں ہے اور قرآن مجید میں یہ دونوں ہی موقعوں پر استعمال ہُوا ہے۔ جو لوگ آخرت کے عذاب و ثواب کو ایک بہت بعید چیز سمجھ کر اپنی بدعملیوں میں بدمست رہتے ہیں کہ جو چیز اتنی دور ہے اس کی فکر میں ابھی سے مبتلا ہو کر اپنے عیش کو کیوں مکدر کریں، ان کو ان الفاظ سے یہ بات یاد دلائی جاتی ہے کہ آج تم جس حساب و کتاب کو بہت دُور کی چیز سمجھ رہے ہو جب وہ سر پر آئے گا تو تم یہ سمجھو گے کہ اس پر تو ایک صبح و شام بھی نہیں گزری۔

اسی طرح جو لوگ اللہ کے اچھے وعدوں کو وعدہ فردا سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ظہور میں ایک غیر متناہی مدت باقی ہے، ان کو ان الفاظ سے یہ تسلی دی جاتی ہے کہ اطمینان رکھو، خدا کے وعدوں کے پورے ہونے میں دیر نہیں ہوگی، جب تمہیں اَجر ملیگا تو محسوس کروگے کہ تمہاری مزدوری تمہارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تم کو مل گئی۔

موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ دھمکی کے سیاق میں نہیں بلکہ تسلی کے سیاق میں ہے۔ یہاں یہ نکتہ بھی پیش نظر رہنا چاہیئے کہ ان معاملات میں ساری اہمیت اس احساس کی ہے جو انسان کو جزاؔ و سزا کے وقت ہوگا۔ اگر جزا و سزا کے وقت کا احساس یہی ہوگا کہ عمل اور جزا کے درمیان کا فاصلہ بالکل غائب ہو گیا تو پھر یہ فاصلہ بالکل ناقابل لحاظ ہے۔ پھر تو صحیح یہی ہے کہ مجرم اپنی سزا کو سامنے رکھے اور مومن اپنی جزا کو۔ نہ وہ مہلت سے مغرور ہو نہ یہ تاخیر سے بے صبر۔ اور اگر کوئی شخص اپنی نافہمی سے اس فاصلہ کو اہمیت دے بھی تو اسے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ " من مات فقد قامت قیامتہ " کہ جو شخص مرا اس کی قیامت کھڑی ہو گئی۔ جو مومن ہے، آنکھ بند ہوتے ہی اس پر اس کے نیک اعمال کی کیفیات کا ظہور شروع ہو جاتا ہے اور کافر پر اس کے بد اعمال کی۔ پھر عمل اور جزاء میں فاصلہ کیا رہا؟ ادھر انسان نے زندگی کا بوجھ اُتارا اُدھر جزا اور سزا کھڑی ہے!

وَاذْكُرُوا اللّٰهَ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْدُوْدٰتٍ .... وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ اِلَيْهِ تُحْشَرُوْنَ | " ایام

میری رائے یہ ہے کہ غسق کے معانی کے تعین میں بھی اسی طرح کا اختلاف ہے جیسا اختلاف دلوک کے معانی متعین کرنے میں پایا جاتا ہے۔ میں یہاں بھی جامع معانی اختیار کرنے کو ہی زیادہ صحیح سمجھتا ہوں۔

دلوک الشمس سے چار نمازیں مراد لینے کے بعد صرف فجر کا ایک وقت باقی رہ گیا تھا، اس کو قرآن الفجر کے الفاظ سے الگ بیان کر دیا۔ اور اس وقت کی نمایاں خصوصیت بھی بتا دی۔

یہ پانچوں اوقات وہ ہیں جن میں نماز باجماعت ادا کرنے کا حکم ہے۔ اب صرف تہجد کی نفل نماز باقی رہ گئی تھی جس کا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خصوصی حکم دیا گیا۔ پس فرض نمازوں کے بعد اس کا ذکر کیا اور اس کی حکمت بھی بیان کر دی۔ چونکہ اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کو ہمارے لئے نمونہ قرار دیا ہے اس لئے نماز تہجد ہمارے لئے سنت قرار پا گئی، جیسا کہ حدیث سے ثابت ہے۔

ہفت روزہ **المنبر** کی ہر سطر دعوت الی اللہ اور اظہار حق کیلئے وقف ہے،
آپ المنبر کا مطالعہ فرمایئے

المنبر کا ہر شمارہ اسلام کی بے لاگ اور فرقہ واریت سے پاک دعوت دیتا ہے۔
اسلام کے خلاف سازشوں کی بے نقابی کرتا ہے اور دین میں تحریف و ترمیم کے فتنہ کی سرکوبی اور اسلامیانِ عالم کو اسلام کے کلمۂ جامعہ پر متحد کرنے کی مساعی کا حامل ہے۔

طرز بیان شگفتہ ——— اور ——— استدلال واضح ھے

سوز و حرارت سے بھرپور مقالات "المنبر" کی خصوصیات ہیں

شرح: سالانہ چندہ ۵ روپے، ایک پرچہ ۱۳ نئے پیسے۔

پتہ

ہفت روزہ "المنبر" پوسٹ بکس نمبر ۱۶ - ۳۴۹ جناح کالونی لائلپور

مقالات

جناب خالد مسعود صاحب

حفاظتِ قرآن

(۳)

عہدِ رسالت میں حفاظتِ قرآن کا اہتمام

ادپر کی بحث میں ہم قرآن کی حفاظت کے فوق البشری عوامل کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ابھی ان اقدامات کا جائزہ لینا باقی ہے جو نزول وحی کے بعد خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اور آپ کے بعد آپ کی اُمت نے حفاظت قرآن کے بارہ میں کئے۔

عہدِ رسالت میں حفاظتِ قرآن کے انتظامات پر بحث کرنے سے قبل قرآن کی حیثیت اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذمہ داریوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ آنحضورؐ پر جو وحی نازل ہوئی اس نے پہلے دن ہی سے اپنی دعوت ہمہ گیر رکھی اور سابقہ آسمانی کتابوں کی طرح کسی خاص قبیلہ یا علاقہ کو مخاطب کرنے کے بجائے عمومی حیثیت میں انسان کو خطاب کیا۔ پہلی وحی ملاحظہ ہو۔

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ اِقْرَاْ وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَا لَمْ یَعْلَمْ (علق ۱-۵)	پڑھ اپنے پروردگار کے نام سے جس نے تخلیق کی، اس نے انسان کو خون کی پھٹکی سے بنایا، پڑھ اور تیرا رب بڑا فیاض ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی، انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔

گویا قرآن نے پہلے دن ہی سے اپنی پوزیشن یہ متعین کی کہ وہ ساری دنیا کے انسانوں کی ہدایت کے لئے آیا ہے اور وقتی یا ہنگامی نوعیت کا صحیفہ نہیں ہے۔ اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کو جس حیثیت

سے متعارف کرایا وہ بھی ایک قومی یا علاقائی نبی کی نہیں بلکہ خاتم النبیین کی حیثیت تھی یعنی آپ کے بعد قیامت تک خدا کی طرف سے کوئی نبی نہیں آنے والا ہے۔ ان حقائق کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ بات بالکل واضح تھی کہ قرآن کو اُمت کے لئے محفوظ رکھنا آپ کے فرائض نبوت میں سے ہے۔ یہی وجہ تھی کہ نہ صرف آپ نے خود اس کو محفوظ رکھا بلکہ ایسے طریقے بھی اختیار فرمائے جن کے نتیجہ میں یہ کتاب علی حالہٖ محفوظ رہ سکے۔ حفاظتِ قرآن کے یہ طریقے چار تھے۔ ۱- تلاوت و تعلیم۔ ۲- حفظ ۳- نماز۔ ۴- کتابت قرآن۔

تلاوت و تعلیم تلاوت و تعلیم کتاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا فرض منصبی تھا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کی یہ ذمہ داری تھی کہ وحی کو لوگوں تک پہنچائیں، اس کے مطالب، اس کی حکمت اور اس کے رموز و نکات کو واضح کریں اور قرآن کو لوگوں کی زندگیوں میں دخیل کر کے ان کے نفوس کا تزکیہ کریں۔

ارشاد ہوا۔

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔ (جمعہ-۲)

وہی ہے جس نے امیوں میں سے ایک رسول بھیجا جو ان پر آیتوں کی تلاوت کرتا، ان کا تزکیہ کرتا اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس ہدایت کی روشنی میں قرآن کی ایک ایک آیت آپ نے اپنے مخاطبوں کے گوش گزار کی، ان کے عقائد و مزعومات کا اس کی روشنی میں تجزیہ کیا، ان کی گمراہیوں سے پردہ اُٹھایا، جو لوگ ایمان لے آئے ان کو قرآن کے رموز و نکات سے باخبر کیا، اس کے اصول و قوانین کو ان کی زندگیوں میں رائج کیا اور ان کو قرآن کے علم و عمل کا نمونہ بنا کر اسی مشن پر مقرر کیا جو خود آپ کا اپنا مشن تھا۔ مسجد نبوی میں صفہ کی درسگاہ خاص اسی مقصد سے بنائی گئی۔ تاریخ میں بے شمار ایسے صحابہ کے نام ملتے ہیں۔ جنہوں نے قرآن مجید سیکھا اور اس کی تعلیم کو پھیلانے کی غرض سے یا تو مسلموں کے مطالبہ پر ملک کے مختلف گوشوں میں پھیل گئے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس نظام تعلیم کے نتیجہ میں قرآن کا کچھ نہ کچھ حصہ بلا امتیاز ہر مسلمان کے پاس محفوظ ہوتا چلا گیا اور اس کی حیثیت سابقہ آسمانی کتابوں جیسی نہ رہی جن کا علم صرف اہل کلیسا تک محدود رہتا تھا اور عوام تک اس کا فیض مشکل ہی سے پہنچتا تھا۔

حفظ حفاظت قرآن کے لئے دوسرا اہم قدم یہ اٹھایا گیا کہ حفظ قرآن کو دین کا ایک مطالبہ قرار دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حفاظت کتاب کے لئے اس سے بہتر کسی طریقہ سے انسان آج تک واقف نہیں ہوا۔ جو چیز سینوں میں محفوظ کر دی گئی ہو اس کو نہ تو کوئی جابر سے جابر بادشاہ چھین سکتا اور نہ زندگی کے ہنگامے اس دولت کو گم کر سکتے۔ کتابوں میں محفوظ کئے ہوئے علم کو معدوم کیا جا سکتا ہے جب اس علم کی کتابیں ضائع کر دی جائیں (جیسا بغداد کی تباہی کے وقت ہوا) لیکن اس علم کو معدوم کرنا جو سینوں میں محفوظ ہو اس وقت تک ناممکن ہے جب تک دنیا میں اس کا جاننے والا ایک بھی شخص موجود ہے۔

حفظ کی یہی اہمیت تھی جس کے پیش نظر نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کو اس کی رغبت دلایا کرتے تھے صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا

ان الذی لیس فی جوفہ شی من القرآن کالبیت المخرب

جس شخص کو کچھ بھی قرآن یاد نہیں وہ ایک اجاڑ گھر کی مانند ہے۔

متعدد روایات میں یہ آتا ہے کہ آپ وقتاً فوقتاً بعض صحابہ سے قرآن سُنانے کی فرمائش کیا کرتے تھے۔

حفظ کے معاملہ میں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیئے کہ عرب میں چونکہ کتابت کا اہتمام کچھ زیادہ نہ تھا اس لئے ان کی حفظ کی صلاحیت بہت زیادہ نشو و نما پا چکی تھی۔ شعراء، خطباء کے کلام اور خاندانوں کے شجرہ ہائے نسب کو یاد رکھنا تو گویا عرب تہذیب کے واجبات میں سے تھا۔ خود صحابہ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق اور عمر فاروق رضوان اللہ علیہم اجمعین مشہور نساب اور ادب کے نقاد تھے۔ مردوں کے ساتھ ساتھ عورتوں میں بھی اس دلچسپی کا پایا جانا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُمہات المؤمنین میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ادب عربی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ زمانہ جاہلیت کے عربی ادب کا تقریباً تمام سرمایہ حفظ ہی کے ذریعہ سے نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوا حتیٰ کہ بعد میں اس کو قلمبند کر لیا گیا۔

غور کرنا چاہیئے کہ ایسی قوم کے سامنے جس کے اندر حفظ کی صلاحیت ایک فطری صلاحیت تھی، جب ان کی سب سے محترم شخصیت نے حفظ قرآن کا مطالبہ رکھا ہو گا تو کتنے لوگ ایسے رہے ہوں گے جنہوں نے اس حکم کی تعمیل میں کوتاہی کی ہو گی؟ ہمارے نزدیک تو عرب جیسی ادب نواز قوم سے یہ بھی بعید نہیں کہ شدید مخالفت کے باوجود محض قرآن کے اعلیٰ ادب اور ظاہری حسن ہی کی بنا

پر بہت سے کفار کو بھی اس کے بعض حصے یاد رہے ہوں۔

اب یہ دکھانے کے لئے کہ صحابہ کرام میں حفاظ کا وجود نقل سے بھی ثابت ہے، ہم چند نمایاں احادیث کا حوالہ دیتے ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے بعثت نبوی کے ابتدائی دور میں اپنے مکان کے ایک گوشے میں جائے نماز بنا رکھی تھی اور وہاں بیٹھ کر بڑی پرسوز آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کیا کرتے تھے (یہاں یہ بات یاد رہے کہ اس زمانہ میں قرآن کی حفاظت کا ذریعہ سوائے حفظ کے کوئی نہ تھا)

صحیحین کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "قرآن چار آدمیوں سے سیکھو۔ عبداللہ بن مسعود، سالم مولی ابوحذیفہ، معاذ بن جبل اور ابی بن کعب سے۔" دوسری روایات میں ان کے علاوہ زید بن ثابت، ابوزید، ابوالدرداء رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نام بھی آتے ہیں۔

مشہور روایات کے مطابق، جنگ یمامہ میں ستر حفاظ قرآن شہید ہوئے۔ تقریباً اسی قدر تعداد غزوۂ بئر معونہ کے حفاظ شہدا کی بتائی گئی ہے۔

حفظ قرآن کے اسی اہتمام کا نتیجہ تھا کہ یہ کتاب علیٰ حالہٖ باقی رہی اور اس کی ایک آیت بھی ضائع ہونے نہیں پائی۔ کوئی سابقہ آسمانی کتاب قرآن مجید کی اس صفت میں شریک نہیں۔ توریت کے معاملہ میں یہ حادثہ پیش آیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کو کلمۂ توحید تو زبانی یاد کرا دیا لیکن احکام شریعت تختیوں پر لکھ دیئے۔ بنی اسرائیل نے ان تختیوں کو صندوق میں بند کر کے رکھا لیکن اس کے باوجود تاریخ کے نشیب و فراز میں ان کی حفاظت میں کامیاب نہ ہو سکے اور اصل کتاب دنیا سے ناپید ہو گئی۔

نماز حفاظتِ قرآن کے لئے تیسرا قدم یہ اٹھایا گیا کہ تلاوت قرآن کو نماز کا ایک جزو قرار دیا گیا۔ قرآن میں ابتدا ہی سے یہ حکم آیا کہ

فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ — پس جتنا آسانی سے پڑھ سکو قرآن پڑھا کرو۔ (مزمل۔ ۲۰)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے یہ بات واضح تھی کہ ہر نماز میں قرآن مجید کے کچھ نہ کچھ حصہ کی تلاوت کرنا ضروری ہے۔ چونکہ مسلمانوں میں نماز کوئی انفرادی چیز نہ تھی بلکہ اس کا باقاعدہ نظام جاری تھا اس لئے کسی مسلمان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ وہ قرآن کو بالکل نظرانداز کر سکے۔ مزید برآں حضور ؐ نے مکمل قرآن کے سننے سنانے کے لئے اپنی زندگی ہی میں تراویح کا نظام بھی جاری کر دیا جس کے تحت یہ ضروری ہو گیا کہ مسلمانوں میں حفاظ کی معتدبہ تعداد موجود رہے جو رمضان المبارک میں قرآن سنائیں اور دوسرے مسلمان اس کو سنیں۔ حضور ؐ کا قائم کردہ یہی نظام نسلاً بعد نسل قرآن کو منتقل کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسی کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی شخص اگر در پردہ قرآن میں تحریف بھی کر لے تو اس کی یہ تحریف اپنے تک محدود رہے گی۔ وہ اسے عوام میں پھیلانے میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔

کتابت اگرچہ حفظ کے بعد حفاظت قرآن کی ضرورت بدرجہ اتم پوری ہو گئی تھی تاہم حضور ؐ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ قرآن کی کتابت کا بھی اہتمام فرمایا۔ اس بات کا اشارہ قرآن کی پہلی وحی سے نکلتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی اس کتاب کے لئے قلم و قرطاس کو ذریعہ اشاعت بنایا جائے گا۔

(عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۔ اس نے قلم کے ذریعے سے سکھایا) اس وحی کی روشنی میں حضور ؐ نے یہ اہتمام فرمایا کہ جتنا جتنا قرآن نازل ہوتا آپ اس کو لکھوا کر رکھ لیا کرتے اور صحابہ کو بھی اجازت ہوتی کہ اگر وہ چاہیں تو اپنے لئے بھی لکھ لیا کریں۔ لیکن اس خطرہ کے پیش نظر کہ لوگ قرآن کی آیات کو حضور ؐ کے تفسیری کلمات سے گڈمڈ کر دیں گے آپ نے یہ واضح حکم دیا کہ

لا تكتبوا عني شيئًا غير القرآن (مسلم) — میرے ہاں سے سوائے قرآن کے کوئی چیز نہ لکھو۔

قرآن کی کتابت کے لئے کاغذ استعمال نہیں ہوا کیونکہ عرب میں اس کا کوئی رواج نہ تھا۔ جن اشیاء پر یہ کتابت ہوئی وہ یہ ہیں۔ پتھر کی باریک سلیں، کھال کی جھلی، پکایا ہوا چمڑا، اونٹ یا بھیڑوں کے شانے کی چوڑی ہڈی، کھجور کی چوڑی ٹہنیاں وغیرہ۔

قرآن کی کتابت کرنے والے صحابہ میں مندرجہ ذیل نام مشہور ہیں:

زید بن ثابت رض، ابی بن کعب رض، خالد بن سعید رض، عامر بن فہیرہ رض، معاویہ بن ابوسفیان رض وغیرہ۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ یہاں پر ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ موجودہ قرآن کی آیات کی ترتیب یا سورتوں کی تقسیم کس کے اشارے سے ہوئی بعض لوگوں کا خیال یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم آیات بس نوٹ کروا دیا کرتے تھے آپنے

جو قرآن چھوڑا اس میں نہ سورتوں کی تقسیم تھی اور نہ آیات اس ترتیب سے درج ہوتی تھیں جس ترتیب سے قرآن کے موجودہ نسخوں میں پائی جاتی ہیں۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق یہ ترتیب و تقسیم حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں زید بن ثابتؓ نے محض اپنی اٹکل سے کی۔

یہ طرزِ فکر محض قلتِ تدبر کا نتیجہ ہے۔ اگرچہ حقیقت حال کو پیش کرنے کے لئے بے شمار پہلوؤں سے غور کر کے یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ قرآن کے نسخوں میں جو ترتیب و تقسیم ہے اسی میں الٰہی کلام کی شان ہے، تاہم ہم صرف وہ قوی احادیث پیش کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی ترتیب اللہ تعالیٰ کے حکم اور جبریلؑ کی تعلیم کے نتیجہ میں خود حضورؐ نے مقرر فرمائی۔ مسند احمدؒ میں سندِ حسن کے ساتھ یہ روایت مروی ہے:۔

عن عثمان بن ابی العاص قال کنت جالسا عند رسول اللہ اذ شخص ببصرہ ثم صوبہ ثم قال اتانی جبریل فامرنی ان اضع ھذہ الآیہ ھذا الموضع من ھذہ السورۃ: ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھی عن الفحشاء والمنکر والبغی

عثمان بن ابو العاص کا کہنا ہے کہ میں رسول اللہ کے پاس بیٹھا تھا کہ دفعۃً آپ نے اپنی نگاہ اٹھائی اور ایک نظر دیکھا اس کے بعد فرمایا کہ میرے پاس جبریلؑ آئے تھے انہوں نے مجھے آیت ان اللہ یامر بالعدل ...... الخ کو فلاں سورہ کے فلاں موقع پر رکھنے کو کہا۔

احمدؒ، ابوداؤدؒ، ترمذی، نسائی اور حاکم کی روایت کے مطابق حضرت عثمانؓ نے فرمایا:

کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تنزل علیہ السورۃ ذات العدد فکان اذا نزل علیہ الشی دعا بعض من کان یکتب فیقول ضعوا ھولاء الآیات فی السورۃ التی یذکر فیھا کذا و کذا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ساتھ کئی سورتیں نازل ہوا کرتی تھیں تو جب کوئی آیت اُترتی تو آپ کسی لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے کہ ان آیات کو اس سورہ میں لکھو جس میں فلاں فلاں چیز کا ذکر آیا ہے۔

حاکم کی ایک حدیث جو انہوں نے شیخین کی شرط پر لی ہے، یہ ہے:

عن زید بن ثابت قال کنا عند رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نولف القرآن من الرقاع

حضرت زید بن ثابتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ہم رقعوں سے قرآن کی تالیف کرتے تھے۔

مذکورہ احادیث سے بلا تکلف جو صورت حال سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ جو آیت بھی نازل ہوتی، اس کے بارے میں جبریلؑ یہ ہدایت بھی لاتے کہ اس کو کون سی سورہ میں کس موقع پر کس آیت سے پہلے یا بعد رکھا جائے گا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کی کتابت کرواتے تو قرآن کے نسخہ میں جبریلؑ کی بتائی ہوئی ترتیب کے مطابق رکھوا دیتے۔ اس طرح تمام سورتیں الگ الگ مرتب ہوتی چلی گئیں۔

یہ دکھانے کے لئے کہ سورتوں کی موجودہ تقسیم خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں بھی پائی جاتی تھی، ہم صرف مشہور مجموعہ ہائے احادیث میں سے چند احادیث پیش کرتے ہیں۔

ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ جبریلؑ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے کہ انہوں نے اوپر سے چرچراہٹ سنی۔ انہوں نے اپنا سر اٹھایا تو کہا کہ آسمان کا یہ دروازہ آج کھلا ہے، اس سے پہلے کبھی نہیں کھلا۔ پھر اس دروازہ سے ایک فرشتہ اترا تو جبریلؑ نے کہا کہ یہ فرشتہ جو زمین پر اترا ہے اس سے پہلے کبھی نہیں اترا۔ اس فرشتہ نے سلام کیا اور کہا نورین یعنی سورہ فاتحہ اور سورہ بقرہ کی آخری آیات کی بشارت ہو جو آپ کو دی گئی ہیں، آپ سے پہلے کسی نبی کو عطا نہیں ہوئیں۔ ان دونوں کا کوئی حرف نہیں پڑھا جاتا مگر یہ کہ اس میں پڑھنے والے کو عطا کرتا ہوں۔ (مسلم)

ابو امامہ باہلیؓ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا کہ قرآن پڑھو تو یہ اپنے پڑھنے والوں کے لئے قیامت کے دن شفاعت کرنے والا ہوگا۔ دونوں روشن سورتیں سورہ بقرہ و آل عمران کو پڑھو یہ قیامت کے دن بدلیوں کی مانند آئیں گی۔ (مسلم)

ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس شخص نے سورہ کہف کی پہلی دس آیتیں حفظ کر لیں وہ دجال سے بچا لیا گیا۔ (مسلم)

ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات پر قادر نہیں ہے کہ وہ رات میں ایک تہائی قرآن پڑھ لے؟" لوگوں نے عرض کی "ایک تہائی قرآن کیسے پڑھا جائے گا؟" حضور نے فرمایا "سورہ قل ہو اللہ احد ثلث قرآن کے برابر ہے۔" (مسلم)

عقبہ بن عامرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا تو نے وہ آیات نہیں دیکھیں جو رات میں نازل ہوئیں کہ کسی نے ان جیسی آیتیں کبھی نہیں دیکھیں یعنی قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔ (مسلم)

سورہ یٰس قرآن کا دل ہے۔ (نسائی، ابوداؤد)

عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہر رات سونے سے پیشتر مسبحات (وہ سورتیں جو سبح یا یسبح سے شروع ہوتی ہیں) پڑھا کرتے تھے۔ (ابوداؤد، ترمذی۔ نسائی)

ان احادیث سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں سورتوں کی تقسیم ہو چکی تھی اور وہ تقریباً انہی ناموں سے پکاری جاتی تھیں جن ناموں کا ذکر قرآن کے موجودہ نسخوں میں ملتا ہے۔ لہٰذا یہ خیال غلط ہے کہ حضورؐ کے وصال کے وقت قرآن متفرق آیات کی صورت میں تھا۔

حفاظتِ قرآن میں اُمت کا حصہ

اللہ تعالیٰ کے وعدہ حفاظتِ قرآن کی تکمیل جن ذرائع سے ہوئی ان میں سے بیشتر کا تذکرہ اوپر ہو چکا ہے لیکن مزید کچھ اقدامات ایسے ہیں جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد اُمت کے ہاتھوں ہوئے اور اگر اُمت ان کے بارے میں غفلت سے کام لیتی تو قرآن پر شاید وہ اجماع نہ ہوتا جس کا مشاہدہ ہم آج کر رہے ہیں۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ ایسے اہم اقدامات کا نبیؐ کے ہاتھوں نہ کیا جانا حفاظتِ قرآن کے وعدہ کے منافی ہے تو ہمارا جواب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ کا قرآن کے حاملین کا ایک گروہ پیدا کرنا اور اس کو حفاظتِ قرآن کی توفیق دنیا بجائے خود اسی وعدہ کی تکمیل ہے۔ جہاں تک اُمتِ مسلمہ کا تعلق ہے اس کا منصب شہداء اللہ علی الناس کا ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا پیغام دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچانا اس کی ذمہ داری ہے۔ خاص طور پر خلافت راشدہ تو کئی لحاظ سے رسالت ہی کا ایک حصہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو تمکین فی الارض کی نعمت اسی دور میں عنایت فرمائی۔ اسلام کے ہاتھوں وقت کی بڑی بڑی حکومتوں کو اسی دور میں شکست ہوئی۔ اس مبارک عہد میں دین کی اشاعت نہایت وسیع پیمانہ پر ہوئی اور اس کو ثبات بھی حاصل ہوا۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ اگرچہ حضورؐ کے وصال کے وقت تک محفوظ ہو چکا تھا لیکن دورِ خلافت راشدہ میں

اس کے گرد جو حصار تعمیر کر دیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج ہر مسلمان پورے وثوق اور اعتماد کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ میں قرآن کا جو نسخہ ہے یہ وہی ہے جو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔

اب ہم خلافت راشدہ کے زمانہ میں حفاظتِ قرآن کے اہتمام کا جائزہ لیں گے۔

دورِ حضرت ابوبکر صدیق رضؓ

حضرت ابوبکر صدیقؓ نے قرآن کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے ایک مکمل نسخہ قرآن وقت کے حفاظ کے تعاون سے سرکاری اہتمام میں تیار کروایا، اسی پر اُمت کو جمع کیا اور اسے نقل و حوالہ کے لئے اپنی تحویل میں رکھا۔

اس نسخہ کی حفاظت کی ضرورت کا احساس اس امر سے ہوا کہ جنگ یمامہ میں مسلمان فوج کے ستر حفاظ شہید ہو گئے۔ اتنی کثیر تعداد میں حفاظ قرآن کی شہادت کو حضرت عمرؓ نے بڑی تشویش کی نگاہ سے دیکھا اور حضرت ابوبکرؓ کو مشورہ دیا کہ ملک کے ہنگامی حالات میں مقتولین کی رفتار اگر یہی رہی تو اس کا اثر کبھی یہ بھی پڑ سکتا ہے کہ قرآن کے حفاظ ناپید ہونے لگیں۔ لہٰذا قرآن کو ضبط تحریر میں لا کر محفوظ کر دینا چاہیے۔ حضرت ابوبکرؓ کو پہلے تو اس تجویز کے قبول کرنے میں تامل ہوا لیکن حضرت عمرؓ کے وزنی دلائل سے انہیں اس ضرورت کے بارے میں شرح صدر حاصل ہو گیا۔ انہوں نے کاتب وحی حضرت زید بن ثابتؓ کو بلا کر کہا کہ آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ میں کتابت قرآن کی ذمہ داری سونپ رکھی تھی اور آپ سمجھ دار نوجوان بھی ہیں لہٰذا آپ از سرِ نو قرآن کا ایک مکمل مجموعہ تیار کریں۔ حضرت زیدؓ نے کچھ تامل کے بعد اس ذمہ داری کو قبول کر لیا اور حفاظ کی معیت میں تحریر شدہ قرآن کو سامنے رکھ کر ایک نیا نسخہ قرآن نقل کرنا شروع کر دیا۔

حضرت زیدؓ کا طریق کار حضرت زیدؓ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہ تھی۔ اس کام کی مشکلات کا اندازہ کرنے کے لئے اس سیاسی صورت حال کو سامنے رکھنا چاہیے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال سے ملک میں پیدا ہو گئی تھی۔ حضورؐ کا معاملہ یہ تھا کہ آپؐ کے ہر حکم پر ساری اُمت متفق ہوتی تھی اور اس پر نکتہ طرازیوں کی کوئی شخص جرأت نہ کر سکتا تھا لیکن آپؐ کی وفات کے بعد ایک تو بے شمار قبائل باغی ہو گئے، دوسرے منافقین اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر اسلام کے مطالبات میں کمی کروانے پر تل گئے۔ مخالفین اسلام اب اس تاک میں تھے کہ مسلمانوں کے کسی غلط اقدام سے فائدہ اٹھا کر اسلام پر کوئی ایسی کاری ضرب لگائیں کہ یہ پودا برگ و بار لانے کے قابل نہ رہ سکے۔

جہاں تک قرآن مجید کا تعلق ہے، یہ اس زمانہ کی سب سے زیادہ اختلافی (Controveccial.) کتاب بن سکتی تھی۔ اسلام میں اس کی اہمیت یہ تھی کہ دین کا دارومدار اسی کتاب پر تھا۔ اندرون خانہ اس کا ایک نسخہ تیار کرنا اور اسی کو مستند قرار دینا یہ معنی رکھتا تھا کہ منافقین اور اہل غرض کو یہ کہنے کا موقع دیا جائے کہ ارباب اقتدار نے نبیؐ کے بتائے ہوئے قرآن میں اپنی مرضی کے مطابق حک و اضافہ کر لیا ہے اور اس کی اصلیت مشکوک ہو گئی ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اسی خطرہ کے پیش نظر کتابت قرآن کے لئے حضرت زیدؓ کو واضح ہدایات دیں اور ایسا طریق کار اختیار کرنے کا حکم دیا جس کے نتیجہ میں کسی کو مخالفانہ ریشہ دوانیوں کا موقع نہ ملے۔

ایک تو آپ نے مسجد نبوی کو کتابت قرآن کا مرکز قرار دیا تاکہ اس کام میں تمام مسلمانوں کی دلچسپی رہے اور جو نسخہ تیار ہو وہ عوام الناس سے چھپ کر نہیں بلکہ ان کی نظروں کے سامنے لکھا جائے۔ دوسرے آپ نے یہ حکم دیا کہ لوگ قرآن کی گواہی دینے کے لئے مسجد نبوی میں آئیں۔ احادیث میں آتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس حکم کا اعلان کرتے رہتے تھے۔ اس کی شکل شاید یہ رہی ہوگی کہ زیر کتابت سورہ کے حفاظ اور دوسرے جاننے والوں کو بلا لیا جاتا ہو۔ اس حکم کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ تمام مسلمان جمع قرآن کے کام میں برابر کے شریک ہو گئے اور نسخہ قرآن کی تیاری کی ذمہ داری کو اپنی ذمہ داری سمجھنے لگے۔ تیسرے آپ کی یہ ہدایت تھی کہ ہر آیت کے بارے میں کم از کم دو عادل مسلمانوں کی گواہی لی جائے۔ ابوداؤد میں ہے۔

قدم عمر فقال من كان تلقى من رسول الله صلى الله عليه وسلم شيئا من القرآن فليأت به وكانوا يكتبون ذلك في الصحف والالواح والعسب وكان لا يقبل من احد شيئا حتى يشهد شهيدان

عمرؓ آئے اور کہا جو شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ قرآن لکھتا رہا ہے وہ اسے لے کر آئے (اور وہ اس کو ورقوں، تختیوں اور کھجور کی ٹہنیوں پر لکھتے جاتے تھے)۔ اور زیدؓ کسی سے کچھ قبول نہیں کرتے تھے جب تک دو گواہ اس پر گواہی نہ دے دیتے۔

اس روایت سے امام سیوطی نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ

هذا يدل على زيدا كان لا يكتفى بمجرد وجدانه مكتوبا حتى يشهد به من تلقاه سماعا مع كون زيد كان يحفظ فكان يفعل ذلك مبالغة فى الاحتياط

یہ واقعہ اس پر دلالت کرتا ہے کہ زید حافظ ہونے کے باوجود محض لکھے ہوئے کو کافی نہ سمجھتے تھے۔ بلکہ ان لوگوں سے گواہی بھی لیتے تھے جنہوں نے حضورؐ سے سماعت کے ذریعہ سے حاصل کیا ہو۔ یہ وہ صرف زیادہ احتیاط کی خاطر کرتے تھے۔

ہماری رائے میں دو شہادتوں کی پابندی سے مقصود احتیاط کے علاوہ یہ بھی تھا کہ اس طریقہ سے قرآن کو استناد کا وہ درجہ دیا جائے جس کی حامل دنیا کی کوئی دوسری کتاب نہیں ہو سکی۔ یہ بات معلوم ہے کہ اسلام ہی نہیں دنیا کے تمام عدالتی نظاموں میں دو شہادتوں پر عدل و انصاف اور معاملات کا انحصار ہے۔ لہذا حضرت ابوبکرؓ کے اس حکم کا مقصد محض احتیاط سے زیادہ یہ تھا کہ اس کتاب کی صحت پر پوری امت گواہ ٹھہرے تاکہ رہتی دنیا تک کسی شخص کو اس پر انگلی اٹھانے کا موقع نہ مل سکے اور کسی زمانہ میں کفار و منافقین، اسلام کو یہ طعنہ نہ دے سکیں کہ نبیؐ کی وفات کے بعد مسلمانوں کے خلیفۂ اول ہی نے قرآن میں اپنی مرضی سے رد و بدل کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے پر آشوب دور میں مخالفین نے اسلام کو ضرب کاری لگانے کے لئے ہر طرح کی ریشہ دوانیاں کیں لیکن تاریخ میں یہ ذکر بالکل نہیں ملتا کہ انہوں نے قرآن کی حفاظت کو بھی موضوع سخن بنایا ہو۔ حقیقت یہی تھی کہ امت کے پورے اجماع اور ایک ایک شخص کے اطمینان کے ساتھ نسخہ قرآن تیار ہوا اور حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں سرکاری نگرانی میں رہا۔

(باقی)

امین احسن اصلاحی

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے گھر میں

ایک شخص کے گھر کی زندگی اس کے سیرت و کردار کا حقیقی آئینہ ہوتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی باہر کی زندگی میں ظاہرداری کی چادر اوڑھ کر نکلتا ہو اور جو کچھ وہ ہے اس سے بالکل مختلف شکل و صورت میں اپنے آپ کو پیش کرتا ہو لیکن گھر کی زندگی میں وہ اپنے اوپر اس قسم کا پردہ ڈالے رکھنے میں زیادہ دور تک کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اول تو کوئی شخص اس قسم کی کوشش کرتا ہی نہیں اور اگر وہ کرے تو اس میں بھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اس وجہ سے کسی شخص کو جانچنے کے لئے بہترین کسوٹی اس کے گھر کی زندگی ہے۔ وہاں اس کو دیکھنا چاہیئے کہ اس کی سیرت کیا ہے؛ جس خدا ترسی اور تقویٰ کا درس وہ باہر دے رہا ہے اس پر وہ اپنے گھر کے اندر کتنا عامل ہے؛ جس اتباع کتاب و سنت کا وعظ وہ دوسروں کو سنا رہا ہے اس پر وہ خود کس قدر عمل کرتا ہے؛ اور اپنے بیوی بچوں سے کس قدر ان پر عمل کراتا ہے؛ جس دین کی اقامت کے لئے وہ خدائی کو جدار بنا ہوا سارے جہان سے لڑ رہا ہے، اس دین کو وہ اپنے گھر کے اندر کس حد تک قائم کرنے میں کامیاب ہو سکا ہے؛ جس سادگی، جس ایثار، جس قناعت، جس صبر اور اخلاص و دیانت کا وہ دوسروں سے مطالبہ کر رہا ہے اس کا جمال خود اس کی گھریلو زندگی میں کتنا جھلک رہا ہے؛ اگر فی الواقع کوئی شخص اس کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو بلاشبہ یہ ایک ایسی کسوٹی ہے جس پر پورے اترنے والے کی اخلاقی عظمت کا اور اس کی سچائی کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایک ایسے شخص کے اصولوں اور نظریات سے تو آپ اختلاف کر سکتے ہیں لیکن آپ اس کو شخص ایک مصنوعی یا ایک بے کردار آدمی قرار نہیں دے سکتے!

آیئے اس کسوٹی پر ہم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کو جانچیں اور یہ دیکھیں کہ آپؐ کی باہر کی دعوت اور گھر کی زندگی میں کس حد تک مطابقت ہے۔ خوش قسمتی سے صرف آپ ہی کی زندگی ایک ایسی زندگی ہے جس کا ہر حصہ دنیا کے سامنے ہے۔ ہم نہایت مستند معلومات کی بنا پر جس طرح یہ جانتے ہیں کہ آپؐ مسجد نبوی کے اندر صحابہؓ کی موجودگی میں کیا کچھ فرماتے تھے اور کیا کچھ کرتے تھے، اسی طرح ہم نہایت مستند معلومات کی روشنی میں یہ بھی جانتے ہیں کہ آپؐ بیوی بچوں کے اندر کس طرح رہتے سہتے تھے۔

آپؐ نے اپنی زندگی پرائیویٹ اور پبلک کے دو حصوں میں تقسیم نہیں کی تھی بلکہ آپ کی زندگی کا ہر حصہ پبلک کے لئے کھلا ہوا تھا کہ لوگ اس کو دیکھیں اور اس سے رہنمائی حاصل کریں۔ آپؐ نے لوگوں سے یہ مطالبہ بھی نہیں کیا کہ لوگ صرف آپ کی پبلک زندگی ہی کو دیکھیں، آپ کی نجی زندگی کا تجسس نہ کریں بلکہ آپؐ نے اپنی پبلک اور اپنی نجی دونوں زندگیاں ایک کھلی ہوئی کتاب کی طرح نہ صرف اپنے دوستوں کے سامنے بلکہ اپنے دشمنوں کے سامنے بھی رکھ دیں کہ لوگ چاہیں تو ان کو اسوۂ حسنہ بنائیں اور چاہیں تو بے خوف و خطر اُن پر حرف گیری کر کے اگر حرف گیری کی گنجائش پائیں۔

دُنیا میں دوسروں کی بیویاں ان کی گھریلو زندگی کے رازوں کی امین ہوتی ہیں لیکن صرف حضورؐ کی ازواج مطہرات کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ پبلک کے نمایندہ کی حیثیت سے آپ کی گھریلو زندگی کی ایک ایک ادا کو محفوظ رکھتی تھیں اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ اس کو پبلک تک پہنچاتی تھیں۔ ایک ایسی زندگی جس کی جلوت و خلوت سب کچھ ہمارے سامنے ہے، بہترین چیز اس مقصد کے لئے ہو سکتی ہے کہ ہم اس میں یہ دیکھ سکیں کہ اس کے دونوں پہلوؤں میں کس حد تک مطابقت پائی جاتی ہے۔

اسی مقصد کو سامنے رکھ کر میں یہ سطریں لکھ رہا ہوں اور میری کوشش یہ ہوگی کہ میں جس پہلو کو بھی نمایاں کروں اُس کے لئے مواد استدلال اصلاً قرآن مجید سے اخذ کروں تاکہ آپ کی سیرت طیبہ کا مستند ترین حصہ جو قرآن میں بیان ہوا ہے اس کا ایک پہلو آپ کے سامنے آئے اور اگر کہیں مزید وضاحت کی ضرورت محسوس ہوئی تو حدیث اور سیرت کے بیان کردہ واقعات سے بھی مدد لوں گا۔

اہل بیت کا مشغلہ

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آتا ہے، وہ یہ ہے کہ آپؐ کے اہل بیت کا رات دن کا مشغلہ بھی وہی تھا جو خود حضورؐ کا رات دن کا مشغلہ تھا۔ یہ صورت نہیں تھی کہ آپ خود تو لوگوں کو بندگی رب اور

اطاعت الٰہی کا وعظ سناتے رہیں اور آپ کے اہل بیت دنیا کی دلچسپیوں اور مادی زندگی کی لذتوں میں منہمک ہوں یا آپؐ باہر تو لوگوں کو زہد و قناعت کی تعلیم اور اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لئے جہاد کی تلقین فرماتے ہوں اور گھر میں آ کر اس تلقین کو بھول کر گھر کی دلچسپیوں اور راحتوں میں کھو جاتے ہوں۔ بلکہ آپ کا جو مشن باہر ہوتا تھا آپؐ اسی مشن کو لیکر گھر میں داخل ہوتے تھے اور جس مبارک شغل میں خود اپنا وقت صرف فرماتے تھے اسی مبارک شغل میں آپکے گھر والے بھی اپنا وقت بسر کرتے تھے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک مشن سورۂ جمعہ میں یہ بیان ہوا ہے:-

هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔

وہی ہے جس نے بھیجا امیوں میں سے ایک رسول انہی میں سے جو ان کو سناتا ہے اللہ کی آیتیں اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو سکھاتا ہے کتاب اور حکمت۔

بعینہٖ اس مشن کی یاد دہانی اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر والوں کو اس وقت فرمائی ہے جب کہ منافقین اور منافقات اس غرض کے لئے دن رات ایک کئے ہوئے تھے کہ کسی طرح آپؐ کی ازواج مطہرات کو اس اعلیٰ نصب العین سے ہٹا کر دنیوی اور مادی زندگی کی لذتوں کی طرف مائل کر دیں۔ چنانچہ منافقوں کی بیویوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کے کانوں میں یہ پھونکنا شروع کیا کہ آپ معزز اور امیر گھرانوں کی بیٹیاں ہیں۔ آپ لوگوں کی پرورش سرداروں کے گھروں میں عیش و آرام کے گہوارے میں ہوئی تھی۔ لیکن اس شخص نے آپ کو عسرت اور فلاکت کی زندگی میں لا کر ڈال دیا ہے۔ اگر آپ ان کی قید سے آزاد ہو جائیں تو بڑے بڑے سرداران قبائل آپ کو نکاح کے پیغام دیتے اور آپ کی زندگیاں بڑے عیش و آرام سے گزرتیں۔ اگرچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات ایسے بالاتر تھیں کہ اس قسم کے شیطانی پروپیگنڈے سے متاثر ہوں تاہم طبائع انسانی کی عام کمزوری کو سامنے رکھ کر اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے ان کو یاد دلایا کہ وہ خدا کی طرف سے ایک عظیم منصب پر سرفراز ہیں۔ اسی منصب کی ذمہ داریوں کیلئے اللہ نے ان کو چنا ہے اور اس دنیا کی کوئی عزت و شوکت بھی اس منصب کی عزت و شوکت کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ چنانچہ فرمایا ہے۔

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ

الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ وَاٰتِيْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا۔ وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا۔ (احزاب ۳۲-۳۴)

اے نبی کی بیویو! اگر تم تقویٰ کی روش اختیار کرو تو تم عام عورتوں کی مانند نہیں ہو۔ پس تم اپنے لہجے میں ایسی نرمی نہ اختیار کرو جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی طمع خام میں مبتلا ہو جائے اور دستور کے مطابق بات کیا کرو۔ اور اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور گزرے ہوئے زمانہ جاہلیت کی سی نمائش نہ کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتی رہو۔ اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم سے دنیا کی آلائشیں دور رکھے، اے نبی کے گھر والو! اور تم کو اچھی طرح پاک کرے اور تمہارے گھروں میں جو اللہ کی آیتیں اور حکمت کی باتیں سنائی جاتی ہیں ان کا چرچا کرو۔ اللہ تعالیٰ لطیف و خبیر ہے۔

ان آیات سے صاف واضح ہے کہ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کو سنوارنے اور سدھارنے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دینے کے لئے بھیجا تھا اسی طرح آپؐ کے گھر والوں کو بھی اسی لئے چنا تھا کہ وہ اس مشن کی تکمیل میں آپ کا ہاتھ بٹائیں جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا مرتبہ سب سے اونچا بنایا تاکہ سب لوگ ہادی و مرشد اور پیغمبر و امام کی حیثیت سے آپ کی پیروی کریں، اسی طرح آپ کی ازواج کا درجہ بھی تمام امت کے مردوں اور عورتوں کے لئے امہات کا رکھا تاکہ سب لوگ ان کو اپنے لئے نمونہ مان کر ان سے زندگی کے وہ طریقے سیکھیں جو ان کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے معلوم ہوئے ہیں۔

جس طرح ان تعلیمات پر سب سے زیادہ اہتمام سے خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم عمل فرماتے تھے جو آپ دوسروں کو دیتے تھے، اسی طرح ازواج مطہرات اور اہل بیت نبوت پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی کہ وہ اپنے گھر سے پھیلنے والے چشمۂ نور سے خود پہلے اچھی طرح منور ہوں پھر اس روشنی سے دوسروں کو منور کریں جس طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کے لئے یہ پسند نہیں فرمایا کہ دنیا کے زخارف ان کو اپنی طرف مائل کریں اسی طرح آپکے اہل بیت کے لئے بھی یہ بات پسند نہیں کی گئی کہ آلائش دنیا کے چھینٹوں سے ان کے دامن

آلودہ ہوں۔ اندر اور باہر دونوں جگہ کامل یکسانی اور کامل مشابہت تھی جس اعلیٰ مقصد کے لئے حضورؐ نے اپنے دن رات ایک کر رکھے تھے اسی اعلیٰ مقصد میں آپؐ کی ازواج بھی دل و جان سے منہمک تھیں۔

شریر اور دُنیا پرست لوگ جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی یکسوئی کو درہم برہم کرنے کے لئے طرح طرح کے فتنے اٹھاتے رہتے تھے، لیکن اللہ کی تائید اور رہنمائی سے آپؐ ہمیشہ ان فتنوں سے محفوظ رہ کر اپنے کام میں لگے رہے اسی طرح منافقین اور منافقات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کی یکسوئی میں بھی خلل انداز ہونے کے لئے طرح طرح کی تدبیریں کرتے رہتے تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو ہر فتنہ سے محفوظ رکھا اور دنیا کی دلفریبیاں ان کو صراطِ مستقیم سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکیں۔

آزادانہ انتخاب

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات نے دنیا طلبی کی تمام رغبتوں اور سرگرمیوں سے الگ تھلگ رہ کر محض اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت، اللہ کے دین کی تبلیغ و اشاعت اور کتاب و سنت کی تعلیم و دعوت کے لئے اپنے آپ کو جو وقف کر دیا تھا تو یہ کوئی مجبوری کا سودا نہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان کے مقدس شوہر چونکہ ایک خاص طرح کی زندگی اور ایک خاص قسم کے مشن پر مامور کر دیئے گئے تھے۔ اس وجہ سے ان کے لئے اب اس کے سوا کوئی راہ باقی ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ چار و ناچار اسی کام میں اپنے آپ کو بھی لگائیں اور طوعاً و کرہاً دنیا کی لذتوں اور راحتوں کے ارمانوں سے اپنے دل خالی کریں۔ بلکہ یہ پاکیزہ زندگی انہوں نے آزادانہ انتخاب سے اختیار کی تھی۔ ان کے سامنے دنیا پیش کی گئی لیکن انہوں نے اس کو ٹھکرا دیا۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو پوری آزادی دی کہ وہ اپنے لئے جو زندگی پسند کریں، اس کا انتخاب کر لیں، انہوں نے ہر قیمت پر آپ کی رفاقت کو منتخب کیا۔

شریروں اور منافقوں نے ان کو طرح طرح سے غیر مطمئن کرنے کی کوشش کی لیکن ان کے اس اطمینان اور اس سکون خاطر میں جو نبیؐ کی صحبت میں حاصل تھا کوئی فرق نہ آیا جس زمانہ میں منافقین کی ریشہ دوانیاں ازواج مطہرات کو غیر مطمئن کرنے کے لئے غیر معمولی طور پر بڑھ گئیں۔ آپ نے حجت تمام کرنے کے لئے اپنی ازواج کو اس بات کا پورا پورا اختیار دے دیا کہ وہ اللہ اور اس کے رسول اور زخارفِ دنیا میں سے کسی ایک چیز کا پوری یکسوئی اور دلجمعی سے انتخاب

کر لیں۔ اگر انہیں دنیا اور دنیا کی راحتوں اور لذتوں کی خواہش ہے تو اللہ کا رسولؐ اس بات کے لئے تیار ہے کہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان کو ان کے حقوق دے دلا کر رخصت کر دے اور اگر وہ دُنیا پر لات مار کر رسول کی محبت و معیت اور اقامت دین کے اس جہاد کے لئے اپنے آپ کو وقف کرتی ہیں تو پھر اس زہد و قناعت کی زندگی پر ان کو قانع ہونا پڑے گا جو وہ گزار رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَاجِكَ إِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا وَزِينَتَهَا فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَالدَّارَ الْآخِرَةَ فَإِنَّ اللَّهَ أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝

اے نبی! اپنی بیویوں سے کہہ دو کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کی طالب ہو تو آؤ میں تمہیں تمہارے حقوق دے دلا دوں اور خوبصورتی کے ساتھ تم کو رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسُول اور آخرت کی طالب ہو تو اطمینان رکھو کہ اللہ نے تم میں سے خوبی طلب کرنے والیوں کے لئے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیویوں کو یہ اختیار دے کر ایک طرف تو ان کے لئے اس بات کا موقع بہم پہنچایا کہ وہ اگر اقامت دین اور اعلائے کلمۃ اللہ کے اس جہاد اور زہد و نفس کشی کی اس ریاضت میں آپ کی شریک سفر رہنا چاہتی ہیں تو اپنے اپنے آزادانہ انتخاب و اختیار سے رہیں تاکہ اس جہاد و ریاضت کا جو اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کے ہاں ملنے والا ہے اس میں پوری پوری حصہ دار بن سکیں۔

دوسری طرف آپ نے ان منافقین کے لئے بھی ان کی کوششوں کا نتیجہ دیکھ لینے کا ایک موقع بہم پہنچایا جو ایک عرصہ سے اس مہم میں لگے ہوئے تھے کہ آپؐ کی گھریلو زندگی میں کوئی بے اطمینانی اور انتشار پیدا کر کے اپنا کلیجہ ٹھنڈا کریں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعلان کے بعد قدرتی طور پر ان کو دلی خوشی ہوئی ہو گی کہ ایک لمبے عرصہ تک فساد کی جو فصل بوتے اور جس کو سینچتے رہے ہیں اب اس کے بار آور ہونے کا وقت آیا ہے وہ متوقع ہوئے ہوں گے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہل بیت کو اکسانے اور ان کی موجودہ زندگی سے ان کو بیزار کرنے کی جو جد و جہد کرتے رہے ہیں اب اس کے نتائج کچھ نہ کچھ ضرور نکلیں گے آپ کی ازواج میں سے سب نہیں تو بعض تو ضرور ہی اس اختیار کے

بعد آپ کی رفاقت سے انکار کر دیں گی اور اس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف پروپیگنڈا کرنے اور آپ کو ایذا پہنچانے کا نیا مواد ان کو ہاتھ آئے گا۔ لیکن ان کے چھکے چھوٹ گئے ہوں گے جب انہوں نے دیکھا ہو گا کہ اس اختیار کے پانے کے بعد آپؐ کی ازواج کا جذبۂ اطاعت و انقیاد اور جوشِ محبت و وفاداری اور بڑھ گیا۔ اور ان میں سے ایک ایک نے صاف صاف الفاظ میں اس امر کا اظہار کیا کہ :-

"آپؐ کی غلامی کے آگے تمام دنیا کی سلطنت اور سارے کون و مکان کی سروری و سرداری بھی ہیچ ہے"

اس طرح یہ حقیقت مخالفین اور موافقین دونوں پر واضح ہو گئی کہ حضورؐ کی ازواج کی زندگیاں اس مقدس مشن کے ساتھ صرف اس لیے نہیں بندھی تھیں کہ وہ حضورؐ کے رشتۂ ازدواج میں منسلک تھیں، بلکہ ان میں سے خود ہر ایک کا مطلوبِ حقیقی بھی یہی مشن بن گیا تھا۔

بخاری میں ابو سلمہ بن عبد الرحمٰن سے روایت ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ان کو بتایا کہ جب مذکورہ آیتِ تخییر اتری تو حضورؐ نے اپنی ازواج میں سے ایک ایک کے سامنے اس مسئلہ کو رکھا اور اس کا آغاز مجھ سے کیا۔ آپؐ نے فرمایا کہ میں تم سے ایک بات کہتا ہوں لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ تم اس کے جواب کے لیے جلدی کرو۔ اس کا جواب تم اپنے والدین سے مشورہ کے بعد مجھے دو۔ اس کے بعد آپؐ نے مذکورہ بالا آیت تلاوت فرمائی میں نے عرض کی اس میں ایسی کیا بات ہے جس کے بارے میں مجھے اپنے والدین سے مشورہ کی ضرورت ہو۔ میں دنیا اور اس کی زینتوں کے مقابل میں اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کی زندگی کو اختیار کرتی ہوں۔

ولائے تو کہ گر بندہ خویشم خوانی
از سرِ خواجگی کون و مکاں برخیزم

پھر یہی سوال حضورؐ نے یکے بعد دیگرے اپنی تمام ازواج کے سامنے رکھا اور سب کا جواب یہی تھا جو حضرت عائشہ صدیقہؓ کا تھا اور اس کے سوا جواب اور ہو بھی کیا سکتا تھا؟ سن و سال کے لحاظ سے اگر دنیا کی زندگی اور اس کی زینتوں کا ارمان ہو سکتا تھا تو حضرت عائشہؓ کے دل ہی میں ہو سکتا تھا، لیکن جب عشقِ حق نے ان کو اس قدر دنیا سے بے نیاز اور آخرت کا طالب بنا دیا تھا کہ اللہ کی محبت اور

رسولؐ کی اطاعت پر سب کچھ قربان کر دینے میں زندگی کی حقیقی لذت محسوس کر رہی تھیں تو دوسروں کا جواب ان کے جواب سے کس طرح مختلف ہو سکتا تھا۔

بعض مستشرقین نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اہلِ بیت پر "حرم" کی پھبتی چست کرتے ہیں، بعض آپ کی ازواج مطہرات کو قیدیوں سے تشبیہ دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں یہ گرفتارانِ بلا تھیں جو صرف اس لیے آپ کے ساتھ بندھی ہوئی تھیں کہ ان کے لیے کوئی راہِ فرار باقی نہیں رہی تھی۔ لیکن کیا پوری تاریخِ انسانی میں ایک مثال بھی اس امر کی پیش کی جا سکتی ہے کہ کسی نے اپنے قیدیوں کے سامنے آزادی کا اختیار نامہ رکھا ہو جو حضورؐ نے رکھا، لیکن قیدیوں نے اس آزادی پر اس کی غلامی ہی کو ترجیح دی ہو؟

محبت، اعتماد اور خودداری کی فضا

لیکن کسی کو یہ گمان نہ ہو کہ اگر حضورؐ اور حضورؐ کے اہلِ بیت نے دنیا کی جگہ آخرت، ثروت و امارت کی جگہ فقر اور خدمتِ نفس کی جگہ خدمتِ انسانیت کے اس نصب العین کو اپنے لئے پسند فرمایا تھا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ آپ کی گھریلو زندگی میں کوئی لذت و کیفیت، کوئی چہل پہل اور سرگرمی اور اتار چڑھاؤ کی کوئی نرمی و گرمی سرے سے باقی ہی نہیں رہ گئی تھی۔ ایک ہموار زندگی تھی ہر قسم کے نشیب و فراز سے خالی ایک پرسکون ماحول تھا، ہر قسم کے جذبات کی مداخلت سے پاک اور محفوظ ایک بہتا ہوا دریا تھا ہر قسم کے تلاطم اور تموج سے یکسر نا آشنا۔ حضورؐ کی گھریلو زندگی کے متعلق جن لوگوں کا تصور یہ ہے ان کا تصور نہایت غلط ہے۔ آپؐ کی باہر کی زندگی کی طرح آپؐ کی گھر کی زندگی بھی ان تمام کیفیات سے معمور اور پر رونق تھی جو ہونا چاہیے۔ البتہ اس میں افراط و تفریط کی بے اعتدالیاں یا عیشِ دنیا کی خود فراموشیاں نہیں تھیں۔ آپ سوتے بھی تھے، جاگتے بھی تھے، آپؐ کھاتے بھی تھے اور بھوکے بھی رہتے تھے۔ آپؐ خوش بھی ہوتے تھے اور ناخوش بھی ہوتے تھے۔ آپ پیار بھی کرتے تھے اور سرزنش بھی فرماتے تھے۔ غرض زندگی کے جتنے پہلو ہو سکتے ہیں آپؐ کی گھریلو زندگی میں بھی وہ سارے پہلو پائے جاتے تھے۔ بس دوسروں کی زندگی سے اگر کوئی فرق تھا تو جیسا کہ عرض کیا گیا یہ فرق تھا کہ زندگی ایک مثالی زندگی تھی اس وجہ سے اس میں کوئی شے نہ اپنے فطری حدود سے آگے بڑھی ہوئی تھی اور نہ اس سے پیچھے ہٹی ہوئی تھی۔ اگر کوئی چیز ذرا بھی آگے پیچھے ہٹتی تو ہمیشہ عالم الغیب کی طرف سے اس کی اصلاح کر دی جاتی۔

آپؐ اپنی ازواج پر حد درجہ شفقت فرماتے تھے یہاں تک کہ بعض اوقات آپ ان کی دلداری کے خیال

سے کوئی ایسی چیز کھانی چھوڑ دیتے جو خود آپ کو مرغوب ہوتی لیکن آپؐ کی ازواج میں سے کسی کے مذاق کے خلاف ہوتی۔ آپؐ کی یہ شفقت و دلداری اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی۔ لیکن ساتھ ہی اس امر سے آگاہ فرمایا کہ یہ چیز اس حد تک نہیں بڑھنی چاہیئے کہ اس کے سبب سے کوئی جائز چیز ناجائز بن جائے۔ آپ اپنی ازواج مطہرات پر حد درجہ اعتماد فرماتے تھے ان کو اپنے رازوں میں شریک کرتے تھے۔ اس لیے کہ اگر بیوی محرم راز نہیں ہے تو کچھ بھی نہیں ہے لیکن اگر بیویوں کی طرف سے ان رازوں کی حفاظت میں کوئی کوتاہی ہوتی تو اس پر آپؐ ان کو سرزنش بھی فرماتے کیونکہ جس طرح شوہر کے لیے یہ بات پسندیدہ ہے کہ وہ اپنی بیوی پر اعتماد کرے اسی طرح بیوی کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے شوہر کے رازوں کی امین بنے اور اس میں کوئی خیانت نہ کرے۔

آپ اپنی بیوی بچوں کو سرزنش بھی فرماتے تھے لیکن سرزنش کرنے کے معاملہ میں بھی حضورؐ کا ایک خاص انداز تھا۔ آپؐ اگر کسی بات پر سرزنش فرماتے تو اس طرح نہیں کہ جس کو سرزنش کی اس کے لتے لے ڈالے بلکہ اس طرح کہ مخاطب بات سمجھ بھی جائے اور اس پر کچھ زیادہ گراں بھی نہ گزرے۔ آپ کی ازواج کے باہمی تعلقات دمعمولی فطری نسوانی جذبات کے وقتی ظہور کے سوا نہایت خوشگوار تھے۔ یہاں تک کہ وہ اپنے راز کی باتیں بھی ایک دوسرے پر ظاہر کر دیا کرتی تھیں۔ اس چیز پر بھی حضورؐ نگاہ رکھتے تھے کہ نہ تو غیر معمولی اعتماد کسی بے راہ روی میں مبتلا کرے اور نہ بلا وجہ سے بے اعتمادی کسی خرابی کا باعث بنے۔ حضورؐ کی ازواج کبھی کبھی خود حضورؐ کے مقابل میں بھی اپنی خودداری کا اظہار کرتی تھیں اور حضورؐ اس کو بھی پسند فرماتے تھے بشرطیکہ یہ اپنی جائز حدود سے آگے نہ بڑھے۔

زندگی کے یہ سارے نشیب و فراز جو حضور کی گھریلو زندگی میں موجود تھے، ایک ایسی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہیں جس کو انسانی زندگی کا بہترین مظہر کہا جا سکتا ہے۔ ہم یہاں قرآن مجید کی آیتیں نقل کرتے ہیں جن میں آپ کی گھریلو زندگی کے بعض مخفی گوشوں کی طرف اشارات کیے گئے ہیں۔ اگر آپ اُن کی تہ میں اتر کر غور کریں گے تو وہ ساری جھلکیاں آپ خود دیکھ لیں گے جو اوپر کی سطروں میں نمایاں ہوئی ہیں:۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ قَدْ فَرَضَ اللَّهُ لَكُمْ تَحِلَّةَ أَيْمَانِكُمْ وَاللَّهُ مَوْلَاكُمْ وَهُوَ الْعَلِيمُ الْحَكِيمُ وَإِذْ أَسَرَّ النَّبِيُّ إِلَىٰ بَعْضِ أَزْوَاجِهِ حَدِيثًا فَلَمَّا نَبَّأَتْ بِهِ وَأَظْهَرَهُ اللَّهُ عَلَيْهِ عَرَّفَ بَعْضَهُ وَأَعْرَضَ عَنْ بَعْضٍ فَلَمَّا نَبَّأَهَا بِهِ قَالَتْ مَنْ أَنْبَأَكَ هَٰذَا قَالَ نَبَّأَنِيَ الْعَلِيمُ الْخَبِيرُ إِنْ تَتُوبَا إِلَى اللَّهِ فَقَدْ صَغَتْ قُلُوبُكُمَا وَإِنْ تَظَاهَرَا عَلَيْهِ فَإِنَّ اللَّهَ هُوَ مَوْلَاهُ وَجِبْرِيلُ وَصَالِحُ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمَلَائِكَةُ بَعْدَ ذَٰلِكَ ظَهِيرٌ۔ (تحریم ۱-۴)

اے نبی! جو چیز اللہ نے تمہارے لیے جائز ٹھہرائی ہے اس کو اپنی بیویوں کی دلداری کے خیال سے اپنے لئے حرام کیوں ٹھہراتے ہو؟ اللہ مغفرت کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔ اللہ نے تمہارے لئے تمہاری خلاف شرع قسموں کا توڑنا فرض ٹھہرا دیا ہے۔ اور اللہ ہی تمہارا آقا و مولا ہے اور وہ علم و حکمت والا ہے۔ اور جب کہ پیغمبر نے اپنی کسی بیوی سے کوئی رازکی بات کہی تو جب ان بیوی نے وہ بات دوسری بیوی کو بتادی اور اللہ نے اس امر سے آپؐ کو آگاہ کر دیا تو کچھ حصہ کا آپؐ نے ذکر کیا اور کچھ حصہ کو حذف کر دیا تو جب آپؐ نے ان بیویوں پر ظاہر کیا تو وہ بولیں کہ آپ کو اس چیز سے کس نے آگاہ کیا؟ آپ نے کہا مجھے خدائے علیم و خبیر نے آگاہ کیا۔ اگر تم دونوں بیبیاں اللہ کی طرف رجوع کرو تو یہی تمہارے شایانِ شان ہے۔ کیونکہ تمہارے دل پہلے ہی سے اللہ کی طرف مائل ہیں۔ اگر تم پیغمبر کے خلاف ایکا کرو گی تو اللہ اس کا مالک ہے۔ اور جبریل اور تمام مسلمان اور ملائکہ اس کے ساتھی ہیں۔

ان آیات میں جس چیز کی تحریم کا ذکر کیا ہے یا جس راز کی طرف اشارہ ہے ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو باتیں اللہ تعالیٰ نے راز رکھیں ان کی کھوج کرید کوئی اچھی بات نہیں ہے بالخصوص نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی ازواج کے درمیان کے کسی راز کو معلوم کرنے کی کوشش کرنا تو ہمارے لئے کسی طرح بھی جائز نہیں ہے۔ لیکن ان آیات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی گھریلو زندگی کے جو پہلو بالکل نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آرہے ہیں انہیں ہمیں ضرور سمجھنا چاہیئے۔ ان سے اس بات کا ثبوت فراہم ہو گا کہ حضور صلعم کی زندگی کوئی بے رنگ، سپاٹ اور بے نشیب و فراز زندگی نہیں تھی۔ بلکہ انسانی فطرت جن پاکیزہ تقاضوں اور جن خوبصورت داعیات سے مرکب ہے، ان کی دھوپ چھاؤں یہاں بھی موجود ہے۔ مثلاً ان آیات کے متعلق میں اتر کر غور کیجئے تو مندرجہ ذیل باتیں نہایت واضح طور پر آپ کے سامنے آئیں گی۔

ایک یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جائز حدود کے اندر اپنی ازواج کی دلداری فرماتے تھے۔ ان کے مذاق کا لحاظ رکھتے تھے اور ان کے جو شوق بے ضرر ہوتے تھے حتی الامکان وہ پورے کر دیتے۔

دوسری یہ کہ آپؐ کی بیویاں آپؐ کی شریک رنج و راحت تھیں۔ آپؐ ان سے ہر طرح کی باتیں

کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپؐ ان کو اپنے رازوں کا امین بھی بناتے تھے۔

تیسری یہ کہ آپؐ کی بیویوں کے آپس کے تعلقات نہایت محبت اور اخلاص کے تھے۔ اگرچہ کبھی کبھی بتقاضائے فطرتِ انسانی ان میں سوکنوں کے سے جذبات بھی ابھر آتے تھے۔ لیکن یہ عام حالت نہیں تھی۔ عام حالت اس قدر اعتماد و محبت کی تھی کہ ایک دوسرے کو شوہر کے راز سے بھی آگاہ کر دیتی تھیں حالانکہ سوکنوں میں یہ اخلاق بہت کم پایا جاتا ہے۔

چوتھی یہ کہ آپؐ کی ازواج کو اپنے گھروں میں جائز حد تک اپنی خودداری کے اظہار کا پورا پورا موقع حاصل تھا۔ یہاں تک کہ کبھی کبھی وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایکا بھی کر لیتی تھیں۔ چونکہ یہ چیز عشق پر بنائے محبت و اعتماد ہوتی تھی اس وجہ سے اس کو ہمیشہ حضورؐ نے گوارا فرمایا۔ صرف اس وقت اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو روکا جب یہ اپنی فطری حدود سے بڑھتی نظر آئی۔

حضورؐ کی گھریلو زندگی کی یہ جھلکیاں ہمیں قرآن مجید میں نظر آتی ہیں۔ اگر اس کو ہم سیرت کی کتابوں میں دیکھیں تو وہاں ہر پہلو سے متعلق ہمیں پوری تفصیلات ملتی ہیں۔ لیکن ان تفصیلات کے لئے اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے اس وجہ سے ہم زاد المعاد کی مندرجہ ذیل چند سطروں پر قناعت کرتے ہیں۔ علامہ ابن قیم رح لکھتے ہیں۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ازواج مطہرات کے ساتھ نہایت محبت اور حسن سلوک کا معاملہ کرتے تھے۔ حضرت عائشہؓ کے پاس انصار کی لڑکیاں جمع ہو جاتیں اور آپؐ ان کو ان کے ساتھ کھیلنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ اگر وہ کسی ایسی بات کی خواہش کرتیں جس میں کوئی شرعی قباحت نہ ہوتی تو آپؐ ان کی خواہش پوری کر دیتے۔ وہ جس برتن سے پانی پیتیں آپؐ بھی اس برتن سے ان کے منہ لگانے کی جگہ منہ لگا کر پانی پی لیتے۔ جس ہڈی کو وہ چوستیں اس ہڈی کو آپؐ بھی لے کر چوستے۔"

"ایک مرتبہ اہل حبشہ مسجد نبویؐ میں اپنے کرتب دکھا رہے تھے۔ آپؐ نے حضرت عائشہؓ کے لئے اس کا موقع پیدا فرمایا کہ وہ آپؐ کے کندھے کی اوٹ سے ان کے کرتب دیکھ لیں۔ دو مرتبہ آپؐ سفر کے موقع پر ان کے ساتھ دوڑے بھی۔ آپؐ فرمایا کرتے تھے کہ تم میں سب سے اچھا وہ ہے جو اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا ہو۔ اور میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سب سے اچھا سلوک کرنے والا ہوں۔ نماز عصر پڑھ کر آپؐ کا معمول تھا کہ آپؐ

تمام ازواج کے ہاں تشریف لے جاتے اور ان کی خیر خیریت دریافت فرماتے۔ پھر شب میں جس کی باری ہوتی ان کے یہاں قیام فرماتے۔" (زاد المعاد جلد ۱ ص ۳۰)

محاسبہ

لیکن اس تمام اعتماد و محبت کے باوجود حضورؐ اپنے اہل بیت کے محاسبہ سے کبھی غافل نہیں ہوتے تھے۔ ایک طرف شفقت و مہربانی کا یہ عالم تھا کہ آپؐ کے خادمِ خاص حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دس سال مسلسل خدمت کی (دوسری روایت میں نو سال کے الفاظ ہیں) لیکن حضورؐ نے میری کسی بات پر اُف تک نہیں کیا لیکن دوسری طرف محاسبہ کا یہ اہتمام تھا کہ دینی معاملات میں اگر ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے صادر ہوتی تو ناممکن تھا کہ وہ آپؐ کی گرفت سے بچ سکے۔

امہات المومنین کی یہ شہادت ہے کہ حضورؐ اپنے ذاتی معاملات میں کسی سے کبھی باز پرس نہیں فرماتے تھے۔ لیکن خدا اور دین کے معاملہ میں ہر کوتاہی پر ضرور باز پرس فرماتے اور اس احتساب سے کوئی محبوب سے محبوب شخصیت بھی نہیں بچ سکتی تھی۔ حضرت عائشہ صدیقہؓ سے زیادہ آپؐ کو اور کون محبوب ہو سکتا تھا؟ ایک مرتبہ ان کی زبان سے حضرت صفیہؓ کے بارے میں یہ الفاظ نکل گئے۔ کہ حَسْبُكَ مِنْ صَفِيَّةَ كَذَا وَكَذَا" (صفیہؓ میں یہ عیب کیا کم ہے کہ ان کا قد چھوٹا ہے) یہ بات ان کی زبان سے نکلی تھی کہ آپؐ نے فوراً ان کو تنبیہ فرمائی اور جن الفاظ میں فرمائی وہ ان کے تیور سے ملاحظہ ہوں۔

"عائشہ! تم نے ایک ایسی بات زبان سے نکال دی ہے کہ اگر وہ سمندر میں بھی ملا دی جائے تو اس کی کڑواہٹ اس کو بھی تلخ کر کے رکھ دے۔"

حضور صلعم کا یہ محاسبہ بھی درحقیقت آپؐ کی محبت ہی کا ایک پہلو تھا۔ جو لوگ اپنے گھر والوں سے محض مادی قسم کی محبت رکھتے ہیں وہ اپنے ذاتی عیش و آرام سے تعلق رکھنے والی باتوں پر تو بڑے سخت گیر اور تنگ مزاج ہوتے ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ کوئی ادنیٰ کوتاہی بھی کسی سے سرزد ہو جائے اور وہ اس کو نظر انداز کر جائیں لیکن خدا اور شریعت کے معاملات میں وہ بڑے روادار اور فیاض ہوتے ہیں۔ بیوی بچوں میں سے جس کا جی چاہے اپنی آخرت کی بربادی کے لئے جو چاہے کر گزرے۔ انہیں کبھی ان کو ٹوکنے کی توفیق نہیں ہوگی۔ حالانکہ حقیقی محبت کا تقاضا یہ ہے کہ ان کوتاہیوں کو تو نظر انداز کریں جو ان کی اپنی ذات کے معاملہ میں ہوں اور ان باتوں پر گرفت کریں جن کا تعلق خود ان کی اپنی آخرت سے ہو۔ حضورؐ کا طریقہ یہی تھا۔ آپؐ اپنے ذاتی آرام سے زیادہ اس بات کے لئے فکرمند رہتے کہ گھر والے اپنی آخرت

کی ذمہ داریوں کی طرف سے غافل نہ ہونے پائیں۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج کا مرتبہ اللہ تعالیٰ نے جتنا اونچا بنایا تھا، اسی اعتبار سے ان کی ذمہ داریاں بھی بھاری تھیں۔ دوسروں کے مقابل میں ان کا اجر بھی دگنا تھا، اور اگر ان سے کوئی جرم سرزد ہو تو اس کی سزا بھی دگنی تھی۔

يَا نِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّأْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضَاعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۔ وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتَعْمَلْ صَالِحًا نُّؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ۔ (احزاب ۳۰-۳۱)

اے پیغمبر کی بیویو! جو تم میں سے کسی کھلی ہوئی برائی کی مرتکب ہوگی تو اس کو دوہری سزا دی جائے گی اور یہ اللہ کے لئے سہل بات ہے اور جو تم میں سے اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبردار رہیں گی اور اچھے کام کرتی رہیں گی ہم ان کو ان کا اجر بھی دوہرا دیں گے اور ان کے لئے ہم نے رزق کریم تیار کر رکھا ہے۔

حضورؐ اپنے اہل بیت کی ان ذمہ داریوں کے احساس سے ہمیشہ گرانبار رہتے اور ہر وقت ان کو دنیا کے بجائے آخرت کی کامیابیوں کے لئے ابھارتے رہتے۔ آپؐ جب شب کی نمازوں کے لئے اٹھتے تو آپؐ کی یہ خواہش ہوتی کہ آپؐ کی بیویاں بھی اس سعادت میں حصہ لیں اور بسا اوقات آپؐ اس کے لئے نہایت نرمی اور محبت سے ان کو شوق بھی دلاتے۔ دروازے پر کوئی سائل آتا تو گھر والوں کو اس کے حقوق یاد دلاتے۔ کوئی مہمان آتا تو اس کی خدمت پر سب کو ابھارتے۔ اور کبھی کبھی سب کو جمع کر کے نام لے لے کر مخاطب فرماتے اور بتاتے کہ اپنی آخرت کے لئے جو کچھ کر سکتی ہو کر لو۔ میں وہاں تمہارے کچھ کام نہ آسکوں گا۔

خالد مسعود صاحب

جنوبی افریقہ کے مسلمان

برطانوی نوآبادکاروں اور بوئر حکومتوں کے درمیان جنگوں کے بعد ۱۹۱۰ء میں صلح کا معاہدہ ہوا تو جنوبی افریقہ کے علاقوں - کیپ، نٹال، اورنج فری سٹیٹ اور ٹرانسوال کو متحد کر کے جنوبی افریقہ کی یونین (Union of South Africa) قائم کی گئی۔ اس یونین کی موجودہ آبادی ڈیڑھ کروڑ سے زائد ہے جس میں ایک کروڑ دس لاکھ کے قریب افریقہ کے اصل باشندے ہیں جو "بنٹو" کہلاتے ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد تقریباً ایک لاکھ ستر ہزار ہے۔ باقی آبادی یورپی آبادکاروں اور ہندوؤں پر مشتمل ہے۔

اصل افریقی باشندوں کا مذہب وہی تھا جو اکثر غیر مہذب لوگوں کا ہوتا ہے یعنی ایک مقتدر اعلیٰ کے وجود کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ آباء پرستی، اکابر پرستی اور بت پرستی۔ سترھویں صدی کے وسط میں یورپین اقوام کا اس براعظم میں عمل دخل شروع ہوا تو وہ اپنے طریق کار کے مطابق مشنری طاقتوں کو ساتھ لے کر آئیں چونکہ کوئی دوسرا مذہب عیسائیوں کا مدمقابل نہ تھا اس لئے انہیں اپنی جد وجہد کا بھرپور ثمر ملا۔ چنانچہ اس وقت دس لاکھ سے زائد افریقی عیسائیت کے پرجوش پیروکار ہیں اور انہوں نے انگریزوں کے طور طریقے اختیار کر رکھے ہیں۔ ڈچ ریفارمڈ چرچ (Dutch Reformed church) اب بھی سالانہ دس لاکھ پونڈ کی خطیر رقم مشنری مقاصد کے تحت صرف کر رہا ہے۔ سینکڑوں مسیحی ادارے رفاہی کاموں میں مصروف ہیں۔ وہ اندھوں، بہروں، اپاہجوں اور بے سہارا بچوں کی امداد کرتے ہیں اور بیواؤں اور بوڑھوں کی بہبود کے لئے کام کر رہے ہیں۔

جنوبی افریقہ میں مسلمانوں کی آمد

اس علاقہ میں پہلے پہل ۱۶۶۷ء میں جاوا کے ملائی مسلمان آباد ہوئے۔ یہ لوگ جاوا میں اپنی آزادی کی جنگ ہار گئے تو انہیں

غلام بناکر افریقہ بھیج دیا گیا۔ یہ لوگ کیپ ٹاؤن میں آباد ہوئے۔ یہاں بھی ان کی حیثیت غلاموں کی تھی اور یہ حیثیت اس وقت تک باقی رہی جب تک غلامی قانوناً ختم نہیں کر دی گئی۔

اگرچہ ان لوگوں کو نہایت سنگین حالات سے سابقہ تھا، تاہم انہوں نے اسلام کے لئے جو قربانیاں دیں ان کی نظیر تاریخ میں بہت کم ملتی ہے۔ یہ رات کی تاریکی میں اپنے آقاؤں کے گھروں سے نکل کر لوگوں کو مذہبی تعلیم دیتے اور اسلام کی تبلیغ کرتے۔ بے شمار واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان ملائیوں نے نہ صرف عیسائی مشنریوں کی رفتارِ کار کو کم کیا بلکہ اسلام کے اثرات کو اپنے سے باہر کے دائرے میں پھیلانے میں بھی کسی قدر کامیابی حاصل کی۔ ان ملائیوں کو افریقہ میں آباد ہوئے تین صدیاں ہو چکی ہیں لیکن انہوں نے اپنا مذہبی تشخص ہی برقرار نہیں رکھا۔ بلکہ اپنا طرز زندگی بھی اب تک محفوظ رکھا ہے۔

ہندوستانی ۱۸۶۰ء میں مزدوروں کی حیثیت میں اس ملک میں داخل ہوئے۔ نٹال کی ترقی میں ان کا حصہ سب سے زیادہ ہے ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ مسلمان زیادہ تر ڈربن اور دیہی علاقوں میں آباد ہوئے اور تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ مقامی آبادی کے ساتھ ان کا رویہ ہمدردانہ تھا۔ اس لئے تجارت کے میدان میں یہ دوسری قوموں کی نسبت زیادہ کامیاب رہے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کے مسلمان ٹرانسوال، پریٹوریا، جوہنسبرگ، اور کیپ کے علاقوں میں آباد ہوئے اور کامیاب تاجر ثابت ہوئے۔ اس وقت ٹرانسوال کے علاقہ میں مسلمانوں کی کافی اکثریت ہے۔

مسلمانوں کا تیسرا طبقہ سواحلیوں پر مشتمل ہے۔ یہ لوگ زنجبار، دارالسلام، نیاسالینڈ، پرتگالی مشرقی افریقہ اور مشرقی ساحل افریقہ کے باشندے ہیں ....

.... یہ لوگ خوددار اور مخلص مسلمان ہیں۔ مؤذن کی خدمت بڑی خوشی سے انجام دیتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ وہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حقیقی وارث ہیں ان کا اخلاص بڑا ایمان پرور ہے۔ ان سواحلیوں کی اکثریت غریب مزدوروں پر مشتمل ہے اور نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ مالدار مسلمان ان بیچاروں کی روحانی و مادی ضروریات کا کوئی خیال نہیں رکھتے

مسلمانوں کی مذہبی حالت

جہاں تک مذہبی تبلیغ کا تعلق ہے، صرف ملائی باشندے اس فرض کو ادا کر رہے ہیں۔

ہندوستانی مسلمان بیشتر اپنے کاروباری عزائم کے تحت افریقہ آئے تھے۔ ہندوستان میں ان کے لئے

زیادہ مواقع نہ تھے لیکن یہاں میدان صاف تھا چنانچہ انہوں نے خوب خوب دولت کمائی۔ ان لوگوں کا مذہب سے تعلق برائے نام اور رسوم و رواج تک محدود ہے۔ اپنے بچوں کو جس قدر مذہبی تعلیم دلواتے ہیں وہ بالکل تیسرے درجے کی ہے۔ جوہانسبرگ میں جہاں کی دولت کا معتدبہ حصہ مسلمان تاجروں کے ہاتھوں میں ہے کوئی ایسا مدرسہ نہیں ہے جو مسلمانوں کی تعلیم کے لئے مخصوص ہو۔ مذہبی تعلیم کا نظام اتنا فرسودہ ہے کہ نئی نسل خود مذہب ہی سے مایوس ہو رہی ہے۔ پورے ٹرانسوال میں کوئی یتیم خانہ نہیں۔ عیسائی مشنری یتیم بچوں کو جگہ جگہ سے جمع کر کے اپنے کنونٹ میں لے جاتے ہیں اور انہیں حسب منشا عیسائیت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بے شمار مسجدیں ایسی ہیں جو مسلمانوں کی بے اتفاقی کی شکایت کر رہی ہیں۔ مدرسے بوسیدہ عمارتوں میں قائم ہیں۔ مالدار تاجروں کو ان باتوں کا کوئی احساس نہیں۔ وہ پیسہ سمیٹنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں اور جب مذہبی یا معاشرتی تنزل کی مثالیں ان کے سامنے آتی ہیں تو شتر مرغ کی پالیسی پر عمل کرتے ہیں۔

جہاں تک کیپ کے ملائی مسلمانوں کا تعلق ہے، مذہب کے ساتھ ان کی وابستگی باقی ہے۔ انہوں نے افریقی زبان اپنا لی ہے اور افریقی اور عربی دونوں زبانوں میں مذہبی تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہیں۔ یہ اپنے بچوں کو قاہرہ بھیج کر اعلیٰ مذہبی تعلیم دلواتے ہیں اور جب "فارغ التحصیل ہو کر .... آتے ہیں تو انہیں مسجدوں اور مدرسوں میں تعلیم کے کام پر مقرر کر دیتے ہیں۔ ان میں سے کئی فاضل شیخ، اسلام کی اشاعت کے لئے سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں اور اسلام کا درد اپنے سینوں میں رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کی راہ میں مالی مشکلات درپیش ہیں، کیونکہ مالدار طبقہ اپنے مذہبی فرائض سے بالکل غافل ہے۔

تبلیغی ادارے

مسلمانوں کے غریب طبقوں میں اسلام کی تبلیغ کا جو احساس موجود ہے وہ دن بدن ترقی کر رہا ہے یوں بھی ملکی حالات اس وقت اسلام کے لئے بہت سازگار ہیں۔ عیسائی ادارے اگرچہ بڑی خطیر رقم یہاں کے باشندوں پر صرف کرتے ہیں لیکن ان کے ہاں سیاہ فام اور سفید فام باشندوں کے درمیان جو تفاوت پایا جاتا ہے وہ سیاہ فام آبادی کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہے۔ حال ہی میں سفید فام آبادی نے کالوں کو اپنے برابر حقوق دینے سے انکار کر دیا اور زندگی کے تمام دائروں میں ان کے ساتھ تمیز روا رکھی۔ حکمرانوں ہی نہیں بلکہ اہل کلیسا کی طرف سے بھی یہ پروپیگنڈا کیا گیا کہ کالے لوگ گوروں سے فروتر ہیں، ان واقعات کی بنا پر افریقی عوام یہ سوچنے پر مجبور ہیں کہ "مسیحی برادری میں شامل ہونے" اور "نجات دہندہ کے فیضان سے نجات پانے" کے وہ وعدے کیا ہوئے جو مشنری

ان کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ اب جب کہ افریقیوں میں قومیت کا احساس اور سیاسی شعور بیدار ہو رہا ہے ان کی مایوسی اور ناراضگی دوچند ہو گئی ہے اور اس نے کلیسا کے عقاید کے خلاف بغاوت کی شکل اختیار کر لی ہے۔ ہزاروں افریقی عیسائیت کو ترک کر کے یا تو اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو اپنا رہے ہیں یا لامذہب ہو گئے ہیں افسوس ہے کہ ان کے کانوں تک اسلام کی دعوت پہنچانے کا ابھی تک کوئی مؤثر طریقہ اختیار نہیں کیا جا سکا۔ تاہم غریب مسلمانوں کی کوششوں سے جو ادارے وجود میں آئے ہیں اور تبلیغ کا کام کر رہے ہیں، ان کی تفصیل یہ ہے:۔

ا۔ اسلامک پبلیکیشن بیورو آف کیپ ٹاؤن —— یہ ادارہ انگریزی زبان میں اسلامی لٹریچر شائع کرتا ہے اور اسے مفت تقسیم کر کے ایک مفید خدمت سرانجام دے رہا ہے

ب۔ اسلامک تبلیغی سنٹر

ج۔ عربک سٹڈی سرکل ڈربن۔ یہ دونوں ادارے مذاہب کے تقابلی مطالعہ پر تقاریر وغیرہ کا اہتمام کرتے اور اس طریقے سے اسلام کی تعلیمات کو روشناس کراتے ہیں۔

د۔ یونیورسل ٹروتھ موومنٹ (Universal Truth Movemet) یہ ادارہ دارالحکومت پریٹوریا میں قائم ہے۔ پہلے تو یہ ایک تبلیغی ادارہ کی حیثیت سے کام کر رہا تھا لیکن اب اس کی مصروفیات افریقہ کی زبانوں۔ افریقانس اور زولو میں قرآن مجید کا ترجمہ کرنے تک محدود ہیں۔

ہ۔ اسلامی مشنری سوسائٹی —— اس ادارہ کو قائم ہوئے صرف پانچ برس ہوئے ہیں لیکن اس قلیل مدت میں اس نے جوہانسبرگ اور ٹرانسوال کے مسلمانوں کو بیدار کرنے میں خاصہ کردار ادا کیا ہے یہ ادارہ تقاریر، مذاکرات اور مذہبی کتب کی اشاعت کے واسطے سے کام کر رہا ہے اور ایک سہ ماہی مجلہ "The Light" نکالتا ہے۔ جس کے قارئین کا دائرہ کافی وسیع ہے۔ پچھلے سال اس ادارہ نے تجرباتی طور پر افریقیوں کی آبادیوں میں اسلامی لٹریچر تقسیم کیا تو اس کے نتیجہ میں جو اثرات پھیلے انہوں نے مشنریوں کے حلقوں میں سراسیمگی پھیلا دی۔

مذکورہ پانچوں اداروں میں آہستہ آہستہ رابطہ و تعلق اور تعاون بڑھ رہا ہے اور وہ دن دور نہیں جبکہ یہ پانچوں متحد ہو کر اسلام کی تبلیغ کا کام کرنے لگیں گے۔

اسلام اور صرف اسلام ہی کے اندر وہ طاقت ہے جو افریقیوں کی الجھنوں کو دور کر کے ان کو دوسری قوموں میں سر بلند کر سکتی ہے۔

(وائس آف اسلام سے ماخوذ) ☆

اقتباسات وتراجم

جناب خالد مسعود صاحب

بُدن اور رُوح کے تقاضے

بنی آدم کا بدن زمین سے اور روح ملکوتِ سماوی سے بنائی گئی اور دونوں کو باہم ملا دیا گیا۔ لہٰذا جب انسان اپنے بدن کو بھوکا پیاسا اور بیدار رکھتا ہے اور اس سے خدمت لیتا رہتا ہے، اس کی رُوح راحت اور لطافت پاتی ہے اور اس مقام کی طرف بلند ہوتی ہے جس سے اس کا خمیر لیا گیا تھا گویا اس وقت یہ عالم سماوی تک پہنچنے کی مشتاق ہوتی ہے۔

لیکن اگر انسان اپنے بدن کو آسودہ رکھتا ہے، خوب سیر ہو کر کھاتا پیتا اور نیند کے مزے لیتا ہے، اپنے بدن کی خدمت اور راحت کے لئے کوشاں رہتا ہے تو اس کا بدن اس مقام کی طرف مائل ہوتا ہے جس سے اس کا خمیر لیا گیا تھا۔ اس حالت میں روح بھی بدن کے ساتھ کھنچ جاتی ہے اور اپنے آپ کو ایک قید خانے میں پاتی ہے۔ جب تک وہ قید خانے کی چار دیواری ہی کو پسند نہ کرنے لگ جائے، عالم بالا سے بے تعلقی اور جدائی کے درد کی اسی طرح فریاد کرتی رہتی ہے جس طرح ایک مصیبت زدہ شخص اپنی مصیبت کے لئے فریاد کرتا ہے۔

فی الجملہ جب جب بدن خفیف ہوتا ہے، روح لطیف ہوتی اور عالم سماوی کی طرف لپکتی ہے اور جب جب بدن ثقیل ہوتا اور شہوات کی طرف مائل ہوتا ہے، رُوح بوجھل ہوتی اور اپنے اصل عالم سے ارضی و سفلی عالم پر آگرتی ہے۔ لہٰذا یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی رُوح تو رفیق اعلیٰ کے پاس ہو اور اس کا جسم زمین پر ہو، بظاہر وہ اپنے بستر پر سو رہا ہو اور اس کی روح سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچ کر عرش کے گرد طواف میں مشغول ہو۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص اپنے بدن کی خدمت

میں مصروف ہو اور اس کی رُوح پستیوں کے دائرے میں گھوم رہی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جب رُوحِ انسان
کے بدن سے جُدا ہوتی ہے تو یا تو وہ رفیقِ اعلیٰ سے جا ملتی ہے یا رفیقِ اسفل سے۔ رفیقِ اعلیٰ کے پاس
ہر نعمت، سرور، مسرت، لذت، آنکھوں کی ٹھنڈک اور عمدہ زندگی ہے۔ اس کے برعکس رفیقِ اسفل
کے پاس ہر فکر، غم، تنگی، مصیبت اور مشکل زندگی ہے۔ اسی لئے خدا نے فرمایا

وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا — اور جس نے میرے ذکر سے منہ موڑا اس کے لئے تنگ زندگی ہے۔

"ضنک" کا مفہوم لغت میں تنگی اور شدت کا ہے۔ ہر وہ چیز جو تنگ ہو "ضنک" کہلاتی ہے
"منزلِ ضنک" کے معنی ہیں تنگ مکان۔ "معیشۃ ضنکا" یعنی "تنگ زندگی" کے الفاظ اس
وسعت وکشادگی کے بالمقابل ہیں جو شہوات اور لذت وراحت مہیا کرنے کے نتیجہ میں نفس اور
بدن کو حاصل ہوتی ہے جب ان چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے تو قلب تنگ ہونے لگتا ہے۔
یہاں تک کہ زندگی تنگ ہو جاتی ہے۔ اس کے بالمقابل جب یہ آسودگیاں نفس کو کم حاصل ہوں
تو اس کا قلب کشادہ ہوتا ہے۔ گویا دنیا میں تقویٰ کے سبب سے اختیار کی ہوئی تنگ زندگی برزخ
اور آخرت کی زندگی میں وسعت کا موجب ہوتی ہے۔ اور دنیا میں خواہشات کے پیچھے چل کر حاصل
کی ہوئی کشادہ زندگی کا نتیجہ برزخ اور آخرت کی تنگ زندگی کی صورت میں نکلتا ہے۔ پس لازم
ہے کہ اس زندگی کو ترجیح دی جائے جو زیادہ اچھی، دائم اور پاکیزہ ہے اور رُوح کی آسودگی کے لئے بدن
کو مشقت میں ڈالا جائے نہ کہ بدن کی آسودگی کے لئے رُوح کو۔ کیونکہ رُوح کی آسودگی اور سختی دونوں
بدن کی آسودگی اور سختی کے مقابلہ میں زیادہ پائیدار اور اہم ہیں۔ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ۔

خلوصِ قلب پیدا کرنے کا طریقہ

جس طرح پانی اور آگ یا گوہ اور مچھلی کا جمع ہونا ناممکن ہے اسی طرح مدح وثنا کی محبت اور
لوگوں کے مال ومنال کی طمع کے ساتھ خلوصِ قلب جمع نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اگر کوئی شخص اپنے
اندر اخلاص کی صفت پیدا کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے طمع کو یاس کی چھری
کے ساتھ ذبح کرے۔ اس کے بعد مدح وثنا سے اسی طرح کی بے رغبتی پیدا کرے جس طرح کی بے رغبتی

دنیا دار لوگ آخرت سے رکھتے ہیں۔ اگر طمع اور مدح وثنا کی محبت کا استیصال ہو جائے تو اخلاص آسان
معلوم ہونے لگتا ہے۔

اگر یہ سوال کیا جائے کہ وہ کونسی چیز ہے جو طمع کو ختم کرتی اور مدح وثنا سے بے رغبت کرتی ہے
تو اس کا جواب یہ ہے کہ طمع کا استیصال صرف اس یقین کے ذریعہ سے ممکن ہے کہ ہر اس چیز کے خزانے
جس کی طمع انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے، خدائے واحد کے پاس ہیں۔ ان میں کوئی دوسرا اس
کا شریک نہیں اور بندے کو خدا کے سوا کوئی دوسرا ان خزانوں میں سے کچھ بھی نہیں دے سکتا۔

مدح وثنا سے بے رغبت ہونا اس وقت آسان ہوتا ہے جب آدمی یہ جانتا ہو کہ نہ تو کسی آدمی
کی مدح اسے نفع یا زینت بخشتی اور نہ اس کی ذم اسے کوئی نقصان پہنچا سکتی ہے۔ ایک مرتبہ نبی صلی
اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایک بدو نے کہا "میری مدح زینت اور میری ذم ایک عیب ہے" تو آپ نے
فرمایا "یہ مرتبہ تو خدا کا ہے"۔

پس صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ آدمی لوگوں کی تعریف کی رغبت نہ رکھے ان کی نہ تعریف فائدہ پہنچا
سکتی اور نہ ذم عیب لگا سکتی ہے۔ رغبت صرف اس ذات کی مدح کا ہونا چاہیے جس کی مدح میں
تمام زینت اور جس کی ذم میں سارے عیب پوشیدہ ہیں۔ اس طرزِ عمل پر آدمی صرف صبر ویقین
کے ذریعہ سے قادر ہو سکتا ہے جب صبر ویقین کا توشہ پاس نہ ہو تو آدمی کی حالت اس مسافر کی ہوتی
ہے جو سواری کے بغیر ہی سمندری سفر کا قصد کرے۔

قرآن مجید میں بھی ارشاد ہے کہ

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّلَا يَسْتَخِفَّنَّكَ الَّذِيْنَ لَا يُوْقِنُوْنَ (روم ۶۰) — پس صبر کرو، بیشک اللہ کا وعدہ سچا ہے۔ اور جو لوگ یقین نہیں رکھتے وہ تجھے ہلکا نہ سمجھیں۔

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ (السجدہ ۲۴) — اور ہم نے ان میں پیشوا بنائے جو ہمارے حکم کی ہدایت دیتے تھے جب وہ صابر رہے اور ہمارے احکام پر یقین رکھتے تھے۔

دُنیاداری کا انجام

جب تک بندہ صبح وشام اس حال میں رہتا ہے کہ خدائے واحد کے سوا اس کی کوئی مراد نہیں ہوتی تو اللہ سبحانہٗ اس کی تمام حاجتوں کی ذمہ داری خود لے لیتا ہے، اس کی فکریں دور کر دیتا ہے اور اس کے دل کو اپنی محبت کے لئے، اس کی زبان کو اپنے ذکر کے لئے اور اس کے اعضاء وجوارح کو اپنی اطاعت کے لئے فارغ کر دیتا ہے۔

لیکن جب ایک بندہ دنیا کو اپنا مقصود بنائے رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی فکروں اور مشقتوں کو اس پر سوار کر دیتا ہے اور اس کو اس کے نفس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کا دل خدا کی محبت سے ہٹ کر خلق کی محبت میں مشغول ہو جاتا ہے، اس کی زبان خدا کا ذکر چھوڑ کر انسانوں کا ذکر کرنے لگتی ہے اور اس کے اعضاء وجوارح خدا کی اطاعت کے بجائے مخلوق کی خدمت اور اس کے کاموں میں مصروف رہنے لگتے ہیں۔ اس طرح یہ شخص دوسروں کی خدمت میں جانوروں کی سی مشقت جھیلتا ہے۔ اس کی حالت لوہار کی بھٹی کی ہو جاتی ہے کہ جس بیچاری کے پیٹ میں محض دوسروں کے نفع کی خاطر دھونکنی سے ہوا بھری جاتی ہے۔

پس ہر وہ شخص جو اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت اور محبت سے منہ پھیرتا ہے، مخلوقات کی عبادت، محبت اور خدمت میں مبتلا کیا جاتا ہے یہی حقیقت قرآن مجید سے بھی ثابت ہے۔ فرمایا۔

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان کو مقرر کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔ (زخرف)

حضرت سفیان بن عیینہؒ کہا کرتے تھے کہ عرب کی کوئی مشہور کہاوت ایسی نہیں جس کا مضمون میں قرآن سے اخذ کر کے نہ دکھا سکوں۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ کہاوت قرآن میں کہاں بیان ہوئی ہے۔ اعط اخاک تمرۃ فان لم یقبل فاعطہ جمرۃ (اپنے بھائی کو کھجور دو لیکن اگر وہ اس کو قبول نہ کرے تو اس کے ہاتھ میں انگارہ تھما دو۔) اس پر سفیانؒ نے کہا "اس کہاوت کا مضمون آیت

وَمَنْ يَعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطَانًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ جو شخص رحمان کے ذکر سے تغافل کرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان کو مسلط کر دیتے ہیں تو وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

میں ہی تو بیان ہوا ہے۔ (الفوائد)

تعبیر کی غلطی

جماعتِ اسلامی کا جائزہ ——— مؤلفہ: وحید الدین خاں

اس کتاب کے مصنف پچھلے پندرہ سال سے جماعتِ اسلامی میں شریک تھے اور اس کے شعبۂ تصنیف وتالیف سے متعلق ہونے کے ساتھ جماعت کی مرکزی مجلس شوریٰ کے رکن بھی تھے۔ اب انہوں نے فکری اختلاف کی بنا پر جماعت اسلامی سے استعفا دے دیا۔ ان کا خیال ہے کہ مولانا مودودی نے جس ڈھنگ سے دین کو پیش کیا ہے، وہ کتاب وسنت اور اسلاف کے تصورِ دین کے مطابق نہیں ہے۔ کتاب میں اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر نہایت مفصل اور تحقیقی مواد جمع کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ وہ پوری خط وکتابت بھی شامل ہے جو اختلاف پیدا ہونے کے بعد طویل عرصہ تک مولانا مودودی اور اس حلقۂ فکر کے دوسرے اکابر اور کتاب کے مصنف کے درمیان اس مسئلہ پر ہوئی۔

کتاب کے مندرجات کی فہرست حسب ذیل ہے:-

(١) گفتگو اور خط وکتابت (اکابر جماعت سے) (٢) تعبیر کی غلطی (نوعیت مسئلہ) (٣) مولانا مودودی کا تصورِ دین (قرآن کی چار بنیادی اصطلاحیں پر تبصرہ) (٤) اسلامی مشن کی تعبیر (ان آیات واحادیث پر گفتگو جن سے جماعت اسلامی کا انقلابی فکر ثابت کیا جاتا ہے) (٥) غلط تعبیر کے نتائج — نظری اور عملی (٦) شبہات (٧) دین کا صحیح تصور (زیر بحث فکر سے تقابل کرتے ہوئے) (٨) قبولِ حق کی رکاوٹیں۔

ضخامت: ٥٢٠ صفحات قیمت: فی جلد چھ روپے محصولڈاک ۱۲/ علیحدہ

نوٹ:- پاکستانی حضرات کتاب کی قیمت مع محصول ڈاک دفتر رسالہ "میثاق" رحمان پورہ۔ اچھرہ لاہور میں جمع کر کے اس کی رسید سے ہمیں مطلع فرمادیں۔ یہاں سے کتاب ان کے نام روانہ کر دی جائے گی۔ قیمت کتاب چھ روپے ہے اور محصول ڈاک ۱۲/ اس طرح فی کتاب سات روپے چار آنے جمع کرائیں۔

پتہ

اِسلامک پبلشنگ ہاؤس، ۹- بدرقہ، اعظم گڈھ (انڈیا)

تقریظ و تنقید

عصمتِ رسولؐ

تالیف : سید حشمت حسین جعفری ایڈووکیٹ ،
صفحات : ۲۷۱ قیمت : تین روپے ،
ناشر : مکتبہ افکار اسلامی گاڑی کھاتہ ، حیدرآباد ،

یہ کتاب ، جیسا کہ اس کے نام سے ظاہر ہے ، یہ ثابت کرنے کے لئے لکھی گئی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی نبوی یا بشری حیثیت میں غلطیوں کا صدور نہیں ہوا اور جو لوگ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضورؐ سے دنیوی امور میں اجتہادی غلطیاں سرزد ہوئیں ، ان کی بات بے بنیاد اور ان کا نظریہ سر بسر باطل ہے۔

یہ کتاب ایک مقدمہ اور چار ابواب پر مشتمل ہے۔ مقدمہ میں مصنف نے "عقیدۂ تخطئۃ الرسول" کا تاریخی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ اور ان عوامل کو متعین کرنے کی کوشش کی ہے جن سے اس نظریہ کو تقویت پہنچی۔ باب اول میں انہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ انبیاء کرام سے قبل از نبوت یا زمانہ مابعد میں خطائیں سرزد نہیں ہوئیں۔ باقی تین ابواب قرآن مجید کی ان آیات پر بحث کے لئے وقف ہیں جن سے یہ غلط فہمی ہوتی ہے کہ حضورؐ سے بعض اجتہادی غلطیاں صادر ہوئیں اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر تنبیہہ کی گئی۔

مصنف نے جس موضوع پر قلم اٹھایا ہے ، اس کے اہم ہونے میں شبہ نہیں۔ ہمارے ہاں فی الواقع اس سلسلہ کی بہت سی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اور ضرورت ہے کہ اہل علم ان کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ مصنف نے جس جذبہ کے تحت یہ کتاب تحریر کی ہے ہم اسے لائق تحسین سمجھ اور اس کی قدر کرتے ہیں۔ وہ جس بات کو ثابت کرنا چاہتے ہیں اس سے ہمیں پورا پورا اتفاق ہے البتہ ثابت کرنے کے لئے انہوں نے جو طریقہ اختیار کیا ہے ، ہمارے نزدیک وہ محل نظر ہے۔

جہاں تک مخالف نظریات پر بحث کرنے کا سوال ہے ، مصنف وکیلانہ مہارت کے ساتھ اس سے عہدہ برآ ہوتے ہیں لیکن جب مسئلہ اپنی بات کو مثبت طور پر پیش کرنے کا ہوتا ہے تو وہ بغیر کسی مضبوط بنیاد کے اپنے نظریات کا محل تعمیر کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ مقدمہ میں عقیدہ تخطئۃ الرسول کا تاریخی جائزہ لیتے ہوئے وہ امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ سے اس کی ابتدا مانتے ہیں۔ اور یہ دعویٰ کرنے کے لئے جس چیز کو انہوں نے بطور ثبوت پیش کیا ہے وہ وہ فرق ہے جو امام صاحب نے فقہ کی تدوین میں حضورؐ کے تشریعی اور غیر تشریعی احکام میں ملحوظ رکھا۔ جہاں آیات کی تاویل کا معاملہ در پیش ہوتا ہے وہاں مصنف الفاظ کے ظاہر مفہومات کا انکار کر کے ان مفروضات پر اپنے استدلال کی بنیاد اٹھا لیتے ہیں جن کو وہ پہلے سے اپنے ذہن میں قائم کر چکے ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر عبس وتولّٰی پر بحث کرتے ہوئے وہ خطاب کی ایسی تبدیلیاں مانتے ہیں جن کے متحمل آیت کے الفاظ ہرگز نہیں۔ ان کے نزدیک پہلی دو آیتوں میں فاعل وہ کافر ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مصروف تکلم تھا لیکن آگے کی آیات کا فاعل کوئی تیسرا شخص ہے جس کے متعلق ان کا مفروضہ یہ ہے کہ اس نے حضورؐ کے طرز عمل پر اعتراضات کئے ہوں گے۔

اسی طرح مصنف کے نزدیک ان تمام آیات کا مدعا جن میں حضورؐ کو استغفار کی تلقین کی گئی ، یہ تھا کہ آپ ان الزامات واتہامات کے مضر اثرات سے خدا کی پناہ چاہیں جو مخالفین آپؐ پر لگاتے تھے۔ اس تلقین کا دوسرا پہلو امت کی بخشش کی دعا کرنا تھا نہ کہ اپنی بخشش کی۔

ان تمام مباحث میں مصنف نے بدیہی حقائق کا انکار کیا ہے اور صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی بات پیش کرنے کے لئے کسی مضبوط بنیاد کی تلاش میں ناکام رہے ہیں یہی وجہ ہے کہ ایک صحیح بات کے اثبات کے لئے انہوں نے اپنی کتاب میں کئی غلط باتیں جمع کر دی ہیں۔ ہمارے لئے یہ تو ممکن نہیں کہ کتاب کے تمام مباحث پر تنقید کریں لیکن ہم وہ اصول پیش کریں گے جس کے ذریعہ سے عصمت انبیاء کے سلسلہ کی غلط فہمیاں رفع ہو جاتی ہیں اور وہ قباحتیں بھی لازم نہیں آتیں جو مروجہ تاویلات کے نتیجہ میں لازم آتی ہیں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جس طرح مختلف افراد کے علم وجہل کی نسبت سے ان کے ایمان و اسلام کے تقاضوں میں بڑا فرق واقع ہو جاتا ہے اسی طرح عام لوگوں اور صلحاء و ابرار کے حسن کارکردگی

کے معیارات بھی متنوع ہوتے ہیں۔ عین ممکن ہے کہ ایک ایسا کام جو ہما شما کے لئے نیکی کے اعلیٰ درجہ میں ہے صالحین کے لئے "گناہ" قرار پائے اور اس سے بھی بلند تر نیکی کا ان سے تقاضا کیا جائے۔ اسی طرح انبیاء کرام ایمان واطاعت کے جس مرتبہ پر فائز ہوتے ہیں وہاں نیکی کے دو کاموں میں اولیٰ کے ترک پر بھی لفظ "گناہ" کا اطلاق کیا جا سکتا ہے۔ قرآن مجید میں انبیاء کی طرف "ذنب" کی جو نسبت کی گئی ہے وہ ایسے ہی مواقع پر ہے۔

باب چہارم میں مصنف نے وہ آیات جمع کی ہیں جن میں بظاہر کلام کا رخ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن دراصل مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔ ہمارے نزدیک "تعیین خطاب" کی بحث قرآن مجید کے اصولِ تفسیر کا ایک اہم حصہ ہے۔ اگر اس کے تمام اطراف[1] کو مدنظر رکھا جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی معصومیت پر شبہ کئے بغیر ان تمام آیات کی تاویل ممکن ہو جاتی ہے جن سے بظاہر کئی پیچیدہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

فاضل مصنف کے ذوقِ جستجو کے پیش نظر ہم انہیں مشورہ دیں گے کہ وہ قرآن کی تاویل میں صرف مضبوط اصولوں ہی کو اپنے لئے مشعل راہ بنائیں۔ کمزور بنیادوں پر نظریات کی عمارت کھڑی کر دینے کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔

مصنف رافضیت کے کسی بڑے تعصب میں مبتلا معلوم نہیں ہوتے، تاہم انہوں نے اپنی تحریر میں امیر معاویہ، عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما اور ان کے ساتھیوں کی تنقیص کی تقریب پیدا کر ہی لی ہے۔ شائد انہیں معلوم نہیں کہ اس طرح کے اشارات کتاب کے علمی پایہ کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں اور مصنف کتاب کے بارے میں بھی قارئین کی رائے اچھی نہیں رہتی۔

مصنف اگرچہ تعلیمیافتہ آدمی ہیں اور نہایت اعلیٰ کتابیں ان کے مطالعہ میں آتی ہوں گی لیکن اس کتاب کی اشاعت میں انہوں نے کسی اچھے ذوق کا ثبوت نہیں دیا۔ کاغذ بالکل ناقص ہے، لکھائی چھپائی خراب اور کتاب اغلاط سے پُر ہے۔ حد یہ ہے کہ قرآن کی آیات کی بھی تصحیح نہیں کی گئی۔

☆

---

[1] تعیین خطاب کی بحث میثاق کے کسی گزشتہ شمارہ میں شائع ہو چکی ہے۔

تاریخ القرآن — تاریخ الحدیث

تالیف : عبدالصمد صارم ازہری

ناشر : ادارہ علمیہ - دھنی رام روڈ - انار کلی - لاہور

علی الترتیب ۲۴۸ اور ۲۳۸ صفحات کی یہ کتابیں ایک ایسے بزرگ کی لکھی ہوئی ہیں جن کے شب و روز تصنیف و تالیف کے کام میں صرف ہوتے ہیں۔ دونوں کتابوں کے آخر میں ان کی تالیفات کی جو فہرستیں دی ہوئی ہیں وہ حیران کن حد تک طویل ہیں۔ ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ اس رفتار کار سے کتابوں کا علمی پایہ کس قدر مجروح ہوتا ہے۔ زیر نظر کتابیں بھی اگرچہ نہایت اہم موضوعات پر لکھی گئی ہیں لیکن افسوس ہے کہ فاضل مصنف نے بڑی سہل انگاری سے کام لے کر ان معلومات کو جمع کر دینے ہی پر اکتفا کیا ہے جو ہمارے لٹریچر میں پہلے سے موجود ہیں اور مصنف کے اسلوب بیان سے کہیں بہتر اسالیب میں پیش کی جا چکی ہیں۔

قرآن وحدیث کی جمع و تدوین کی تاریخ سے کس علم دوست شخص کو دلچسپی نہ ہوگی؟ دین کے ان بنیادی مصادر کے خادموں کے حالات سے واقف ہونے کے لئے کس کے دل کے اندر تڑپ نہیں ہوگی؟ مفسرین و محدثین کے علوم کی اصطلاحات کو روشناس کرانے کی اہمیت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ یہ تمام سوالات بہت اہم ہیں اور صارم صاحب کی کتابیں انہی سوالات کا جواب دیتی ہیں لیکن بٹے ہوئے اقتباسات طویل احادیث کے متون اور ترجمے اور مصنف کی طوالت پسندی قاری کو بہت سی غیر ضروری تحریر پڑھنے پر مجبور کرتی ہے۔ کتابوں میں فکر انگیز مباحث تقریباً ناپید ہیں۔

دونوں کتابوں کی ترتیب ایک سی ہے اور یہ چار ابواب پر مشتمل ہیں۔ پہلے باب میں جمع و تدوین کی تاریخ بیان کی گئی ہے، دوسرے باب میں اہم مصاحف یا کتب حدیث کا بیان ہے۔ تیسرے باب میں علوم قرآن وحدیث سے متعلق متفرق معلومات اور اصطلاحات درج کی گئی ہیں اور چوتھے باب میں ان شخصیات کا تعارف ہے جنہوں نے اپنے اپنے دور میں قرآن یا حدیث کی نمایاں خدمات انجام دیں۔

پہلے تینوں ابواب کی افادیت سے ہم مطلق انکار نہیں کرتے لیکن دونوں کتابوں کے چوتھے باب

کی افادیت میں ہمیں شبہ ہے۔ ان ابواب کے مطالعہ کے بعد پڑھنے والا کچھ اہم شخصیتوں کے ناموں سے تو ضرور واقف ہو جاتا ہے لیکن دو دو چار چار سطر کے تعارف سے وہ کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکتا۔ بعض تذکرے تو سرے سے ان خدمات کے ذکر ہی سے خالی ہیں جو ان بزرگوں نے قرآن یا حدیث کے لئے انجام دیں۔

تاریخ القرآن میں مصنف نے قرآن کی سورتوں کا باہمی ربط بتانے کی سعی بھی کی ہے۔ لیکن اس کا صرف یہ فائدہ ہوا ہے کہ ان کی کتاب کی ضخامت میں ۲ صفحات کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جہاں تک ربط سور کا تعلق ہے، مصنف کے اشارات کسی کام نہیں آتے۔

فاضل مصنف کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ دوران تحریر میں کہیں نہ کہیں اپنا تذکرہ بھی ضرور کرتے ہیں۔ تاریخ القرآن کے آخر میں تو انہوں نے اپنی سوانح عمری بھی تحریر کر دی ہے۔ معلوم نہیں انہیں یہ احساس کیوں نہ ہوا کہ اس طرح کی چیزوں سے کتاب کی ثقاہت کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

دونوں کتابیں مجلد ہیں اور علی الترتیب چھ روپے اور چار روپے کے عوض حاصل کی جاسکتی ہیں۔ تاریخ الحدیث نیوز پرنٹ پر چھپی ہے، لیکن دوسری کتاب سفید کاغذ پر چھاپی گئی ہے۔

(خ - م)

اسلامی قانون کی تدوین

مولانا امین احسن اصلاحی کی تازہ ترین تالیف

قیمت اعلیٰ ایڈیشن ۳/- روپے
" سستا ایڈیشن ۲/- روپے
علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ

مکتبہ میثاق رحمان پورہ (اچھرہ) لاہور ۱۲

محی الدین پرنٹر و پبلشر نے نقوش پریس لاہور میں چھپوا کر دفتر "میثاق" رحمان پورہ اچھرہ لاہور ۱۲ سے شائع کیا۔